میرے عہد کے لوگ

از قلم
نسیم اختر شاہ قیصر
استاد دار العلوم (وقف) دیوبند

ناشر
ازہر اکیڈمی شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴

میرے عہد کے لوگ

ازقلم

نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم (وقف) دیوبند

ناشر
ازہر اکیڈمی شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴

تفصیلات

نام کتاب.......................میرے عہد کے لوگ
مصنف .... نسیم اختر شاہ قیصر
صفحات ۲۰۰
مطبع .... محبوب پریس دیو بند
باہتمام ....عبید انور شاہ قیصر، عزیر انور شاہ قیصر،
خبیب انور شاہ قیصر
سن اشاعت.......................فروری ۲۰۰۵ء
پہلا ایڈیشن.........................۱۱۰۰ رسو
قیمت.......................

ملنے کے پتے

دار الکتاب دیوبند

فیصل پبلیکشنز دیوبند

مکتبہ ملّت دیوبند

ناشر

ازہر اکیڈمی شاہ منزل

محلّہ خانقاہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴

انتساب

|||

والدہ مرحومہ

اور

لختِ جگر

آفرین شاہ مرحومہ

کے نام

جن کی یادیں رونے پر مجبور کرتیں

اور جن کی جدائی سوہانِ روح بنی ہوئی ہے

نسیم اختر شاہ قیصر

فہرست مضامین

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

خدا اگر نفس جبرئیل دے تو کہوں!

نسیم اختر شاہ قیصر

ابھی فکر و شعور کی چند منزلیں ہی طے کی تھیں کہ نہ معلوم شورش کاشمیری کی کتاب ''چہرے'' کیسے میرے ہاتھ لگ گئی اس دن سے آج تک چہرہ شناسی میرا کام ہے گو چہرہ شناسی کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا مگر جس کو جیسا دیکھا اور جیسا پایا نوک قلم سے صفحۂ قرطاس پر ویسی ہی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے یہ تصویریں کس حد تک آپ کو پسند آئیں گی مطالعہ کے بعد ہی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

میرے نزدیک یہ تمام لوگ علم و آگاہی کا عنوان اور فکر و دانش کا سرمایہ ہیں یہ سرمایہ محفوظ ہو جائے اور سماج کے زندہ، متحرک اور پھر مخلص، ایماندار، صاحب صلاحیت افراد کا تذکرہ سامنے آجائے یہی میری خواہش تھی اور یہی میری لگن میرا ذہن ہمیشہ یہی سوچتا اور کاموں پر مجبور کرتا ہے۔

تجھ کو لکھنا ہے تو کچھ دنیا کے معماروں پہ لکھ
معتبر مضموں کوئی شائستہ کرداروں پہ لکھ

یا پھر یہ سوچ کچھ کرنے پر اکساتی ہے

عنادل کو تو غم ہے صرف اپنے آشیانے کا
یہاں سارا چمن موضوع ہے میرے فسانے کا

دیو بند بلاشبہ ایک چمن ہے ایک ایسا چمن جس کے پھولوں سے دنیائے علم وادب میں خوشبو ہے، مہک ہے رعنائی اور دل کشی ہے دیو بند ایک روشنی کا مینار ہے فکرو دانش کا چراغ ہے عقیدے کی سلامتی تعلیمات اسلامی کا مرکز اور ایک ایسا منبع ہے جس سے دور دور تک پیاسوں کی پیاس بجھ رہی ہے علم کے شیدائی، ادب کے متلاشی یہاں پہنچتے ہیں اور سیراب ہوتے ہیں ''میرے عہد کے لوگ'' کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے ابھی منزل دور ہے یہ صرف ایک پڑاؤ ہے پہلا پڑاؤ، اگلے پڑاؤ پر کچھ اور لوگوں سے ملاقاتیں ہوں گی، کچھ اور چہروں کو ہم پڑھیں گے، کچھ اور کرداروں سے روشنی حاصل کریں گے، کچھ نئی صورتیں ہمارے سامنے ہوں گی ان کے کارنامے ہوں گے، ان کی علمی معرکہ آرائیاں ہوں گی، ان کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہوگا۔

اس کتاب کی تکمیل میں جو لوگ حصہ دار رہے اور جنہوں نے اپنے بھرپور قلمی تعاون سے نوازا ان میں عم محترم حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی مدظلہ، محترم ڈاکٹر تابش مہدی صاحب، محترم ڈاکٹر ظفر مراد آبادی صاحب، محترم مولانا قمر عثمانی صاحب، برادرم ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب کا شکر گزار ہوں برادر مکرم و محترم مولانا ندیم الواجدی صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود قیمتی مقدمہ تحریر کیا اور مقدمہ لکھنے کی میری ضد خوبصورتی کے ساتھ پوری کی ان کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں برادرم مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی نے کتاب کی طباعت کے مرحلہ کو آسان اور سہل بنادیا وہ بھی ہر طرح شکریہ کے مستحق ہیں

بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ رب العٰلمین ان تمام حضرات کو ان کے خلوص اور محبت کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور اس کتاب کو قبول عام کی دولت سے نوازے (آمین)

نسیم اختر شاہ قیصر

۲۵ / جنوری ۲۰۰۵ء

تبرکات

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی مدظلہ
شیخ الحدیث دار العلوم (وقف) دیوبند

اسلام میں شخصیت پرستی کا تو کوئی تصور نہیں البتہ اپنے اکابر کا ذکر و تذکار، ان کے جلیل کارناموں کو محفوظ رکھنے کی کوشش، ان کے علوم و معارف کی اشاعت، ان کے فکر و سخن کی حفاظت، انشاء کے اچھوتے نمونے، نادر صحافت کی تصویر باقی رکھنے کی ہدایت بھی ہے اور اس کے نتائج سے آگاہی بھی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذکرو موتکم بالخیر

پیر دانا شیخ سعدیؒ نے اس مشر حکم کی غرض و غایت بھی کھول کر رکھ دی

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

گر تو خواہی نامِ نیکت پائدار

خاکسار نے مختصری زندگی میں دیکھا کہ بات گھوم پھر کر توفیق پر آ ٹکتی ہے بہت سے خانوادے کہ دولت کا انبار ان کا امتیاز، وسائل و اسباب کا ہجوم ان کی انفرادیت مگر انہوں نے اپنے اسلاف کے ذکر و فکر سے دامن اس طرح جھاڑا کہ غبار راہ تک موجود نہ رہا اور بہت سے بیکس و بے بس، بیچارگی کا مرقع، ناداری کی بھیا نک

تصویر مگر اسلاف کو یاد رکھنے کے جذبات سے دل و دماغ معمور، سینۂ بے کینہ ان ہی جذبات سے تلاطم پذیر انہوں نے قلم سنبھالا تو شخصیتوں کے جاذب نظر مرقع تیار کئے قرطاس انہیں میسر آیا تو اشخاص کو زندہ و جاوید کر ڈالا۔

والد مرحوم کی وفات کے وقت ہمارا مختصر سا خاندان بے کسی کی بھیانک تصویر تھی مرحوم نے نہ دولت و تمول کے انبار لگائے تھے نہ خطام دنیا کی آلودگیوں سے اپنی شفاف روح کو داغدار کیا تھا۔ اولاد کی تربیت کا تو کیا سوال برادر بزرگوار مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم عمر ۱۲ ر اور ۱۴ ر کے درمیان یتیمی کے زخم سے جسم زار زار مگر عمر بھر کی توانائیاں، شباب و شیب کی منزلیں، طفولیت کی پگڈنڈیاں اسی غم میں صرف کر دیں کہ اپنے نامور باپ کو محفوظ کر لیں کیا ٹھکانہ ہے اس شغف کا کہ والد مرحوم کے لکھے ہوئے خطوط بھی ان کے پاس محفوظ، ان کے اشعار کا پورا سرمایہ سینے سے لگائے ہوئے خود ''الانور'' نکالا دیوبند سے ''استقلال'' نکلا مراد آباد سے ''خالد'' نامی مجلہ ''مدینہ'' بجنور زمیندار لاہور، ''الامان'' ''وحدت'' دہلی کے اخبارات و جرائد، مجلات و رسائل میں مرحوم علامہ کی شخصیت کا تعارف پیش کرتے رہے دوسروں کو نمایاں کرنے کا یہ جذبہ مرحوم بھائی پر ایسا مستولی تھا کہ میرے دوسرے جواں مرگ بھائی اکبر شاہ المغفور کے نام سے ''بچوں کا باغ'' ''غنچہ'' بجنور وغیرہ میں مضمون اور خود شعر کہہ کر چھپوائے۔

خوب یاد ہے کہ مرحوم بھائی کے یہ اشعار دوسرے مرحوم بھائی کی جانب سے اس سانحہ کے بعد منظر عام پر آئے دو چار شعر یاد ہیں آپ بھی سن لیجئے:

چرخ نیلی فام پر کالی گھٹا چھانے لگی
موسم برسات کی ٹھنڈی ہوا آنے لگی

اور مقطع

اکبر رنگیں نوا کا یہ ترانہ واہ واہ
بلبلِ نغمہ سرا بھی وجد میں آنے لگی

جوانی کو ختم کر کے کہولت میں قدم رکھ رہے تھے ''حیات انور'' شائع کی، کشمیر میں سیمینار کرایا، چن چن کر تلامذہ کو جمع کیا، چنیدہ و چیدہ مقالات شائع کئے اسی شغل میں پیک اجل نے قلم رکھوا دیا اور قرطاس زینت الماری بن گئے۔

الحمدللہ کہ یہ شوق وشغف، یہ پیارا جنون، یہ والہانہ تڑپ خانوادۂ انوری میں اب بھی وراثتاً چلی آ رہی ہے راقم الحروف نے جو کچھ کیا کہیئے کہ بے منفعت لکھئے کہ بے سود لیکن ع

شغل اپنا یہی ہے صبح و شام کا

برادر زادہ مولوی نسیم اختر شاہ قیصر سلمہ استاذ دارالعلوم (وقف) دیوبند اپنی بے سروسامانی کے باوجود اس عشق کو سینے سے لگائے ہوئے اور اس محبوب شغف سے اس کا سرگراں کیا قدر کریں گے ان ناداروں کی ان حسین کوششوں کی وہ جن کے اکابر کے مزار بھی مدتوں بیکسی کا شکار نظر آتے جنہیں نہ اپنے بزرگوں پر لکھنے کی توفیق نہ لکھوانے کا عشق جنوں آمیز

عزیز سلمہ نے اپنے قلم کے اس تازہ وارد میں دیوبند اور دیوبند سے متعلق شخصیتوں کو علمی ہوں یا ادبی، سیاسی ہوں یا صحافتی، زندگی کی پگڈنڈیوں پر مست خرام ہوں یا آغوش لحد میں مصروف خواب سب کو آب حیات کے قطرے دیئے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی۔

عزیز موصوف معروف قلمکار، دینی، علمی، تحقیقی مجلّات انکی نگارشات سے مزین، تقریر کا وہبی ملکہ، تحریر کا دلکش سلیقہ و قرینہ پڑھئے سر دھنئے پڑھ کر فارغ ہوں گے تو یہ دو شعر وردِ زبان ہوں گے کچھ شرکاء، فہرست اس شعر کا مصداق

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

باقی سب اس حقیقت کے ترجمان

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

مجھے یقین ہے کہ عزیز سلمہ نے دوسروں کو محفوظ کیا غیب سے کوئی شخصیت اس کی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے ضرور پیدا ہوگی انشاء اللہ دانائے شیراز کی وہ بات کیسے غلط ہوسکتی ہے جو ابتداء میں آپ کو سنا آیا ہوں۔

انظر شاہ مسعودی کشمیری

۱۰ر جنوری ۲۰۰۵ء

قرطاس وقلم کا سفر

حضرت مولانا قمر عثمانی صاحب مدظلہ

قلم وقرطاس کی تاریخ داستان اور اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی قلم کی بیان عظمت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے کلام پاک میں اس کی قسم کھائی ہے ارشاد فرمایا:

نون ۝ والقلم ۝ ومایسطرون ۝ یعنی قسم قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں اس سے بڑھ کر قلم کی فضیلت اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ خالق کائنات اس کی اہمیت کو مؤکد فرمارہے ہیں یہ ایک عطائے ربانی ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتا ہے اپنے مدعا کو ظاہر کرتا ہے اور دوسروں تک اپنے فکر اپنے خیال اور اپنے مقصد کو پہنچاتا ہے خیال وفکر کی یہ ترسیل کوئی اپنے سادہ اور سرسری انداز میں کرتا ہے اور کوئی قدرے سنوار کر اور سجا کر اپنی بات کہتا ہے اور کوئی فصاحت وبلاغت کے ساتھ اور برجستہ تراکیب اور پرکشش انداز میں بیان کے مقام پر آکر مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ تیسرا طریقہ بیان ہی مؤثر لائق توجہ اور قابل ذکر ہوتا ہے اور اسی کو ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہر دور کے کچھ تقاضے اس کے کچھ رجحانات اور میلانات ہوتے ہیں زبانیں انھیں کا اثر لے کر اپنے طریق اور اپنے اسلوب کے چولے بدلتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتی ہیں ایسا ہر زبان کے ساتھ ہوتا ہے اور ایسا

ہونا منطقی طور سے بالکل درست ہے اس لئے کہ کوئی زبان اپنے عصری رجحانات سے بے نیاز ہو کر نہ چل سکتی ہے اور نہ شاید زندہ رہ سکتی ہے اور کسی زبان کا اس میں استثناء نہیں ہے اردو زبان بھی مذکورہ منطقی ضابطے کے تحت اس دائرے سے باہر نہیں ہے اردو اپنے ابتدائی دور میں جس شکل وصورت میں آہستہ آہستہ اپنے بچپنے کی منزلیں طے کر رہی تھی وہ شکل وشبیہ اس کی آنے والے بعد کے دور میں نہیں تھی اور مختلف ادوار سے گذرتی ہوئی بچپنے سے جوانی اور جوانی کی منزل سے گذرتی ہوئی اردو آج شہرت وعظمت کے جس مقام پر ہے، وہ مرحلہ بہ مرحلہ تغیر پذیر ہوتے رہنے کا ہی نتیجہ ہے وجہ یہ کہ تغیر وتحریک ارتقاء کے ضامن اور جمود وتعطل ناکامی اور نامرادی کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں اردو کے بننے سنورنے اور عروج واقبال مندی کے قابل رشک مقام پر پہنچانے میں بلاتفریق مذہب وملت عوام وخواص علماء وصوفیاء کرام کے دوش بدوش قلم کاروں ادباء وشعراء وغیرہ نے برابر کا حصہ لیا ہے اور آج یہ زبان اپنے بیش قیمت خزینے کے طفیل کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے ہم پلہ ہونے کا دعوی بلاتکلف کرسکتی ہے اپنی شیرینی حلاوت کشش اور دل کشی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ مخالفتوں اور مخاصموں کی شعلہ بار ہواؤں کے باوجود اعتماد کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اردو پروگراموں کا دلچسپی کے ساتھ سنا اور دیکھا جانا اردو رسائل واخبارات کا طلب وشوق کے ساتھ پڑھا جانا اس کی بین شہادت ہے میں یہ مانتا ہوں کہ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے نوجوانوں کا تعلق اردو سے بہت کم ہوا ہے اور اردو تہذیب سے ناآشنائی اور بیگانگی میں اضافہ ہوا ہے تاہم مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں بلکہ اردو کے عاشقوں کو اپنے اپنے دائروں میں اس کے لئے عملی جد وجہد کرنے کی ضرورت ہے مختلف اصناف کے حوالے سے اردو میں جو کچھ لکھا جارہا ہے اس کی اہمیت اور قدر وقیمت سے مجال انکار ممکن نہیں ہے خوش فہمیوں کے ہوائی محل اور مایوسیوں کے اندھیروں دونوں سے دامن بچاتے ہوئے پختہ عزم اور مکمل خود اعتمادی کے ساتھ سنجیدہ کوششیں جاری رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ روشن مستقبل قدم نہ چوم لے۔

مجھے نہیں معلوم کہ سیرت نگاری اور خاکہ نگاری دونوں ایک ہی چیز ہیں یا ان میں فرق ہے البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ شخصیات پر لکھے گئے مضامین میں پڑھنے والے کو ایک خاص دل چسپی ہوتی ہے، وجہ یہ کہ اس کا تعلق زمین پر بسنے والے اور مسائل حیات سے دو چار ہونے والے ایسے انسان سے ہوتا ہے جو آنکھوں سے نظر آنے والی ایک حقیقت ہوتا ہے صرف ذہن میں حاصل ہونے والا اور نظر نہ آنے والا تصور نہیں ہوتا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء کے آس پاس کی بات ہے کہ دلّی سے ایک ہفتہ وار پرچہ نکلتا تھا ''پیام مشرق'' مالک تھے مستحسن فاروقی مرحوم اور ایڈیٹر ہوا کرتے تھے عبدالباقی پی۔ ایچ۔ ڈی مرحوم انہوں نے اس پرچے میں ایک سلسلہ شروع کیا عنوان تھا قلمی چہرے مشاہیر وقت کے تعارفی خاکے عبدالباقی مرحوم کے قلم سے ہوتے تھے بحیثیت ایڈیٹر ان کے لکھے ہوئے اداریئے بہت ہی فکر انگیز جامع اور بھر پور ہوتے تھے اس سے بھی زیادہ خوبصورت اسلوب برجستہ اور نادر تراکیب سے مزین ان کے لکھے قلمی چہرے ہوتے تھے برجستگی اور روانی کے ساتھ دل کش تشبیہات اور استعارات سے ''قلمی چہرے'' پورے پرچے کی جان ہوتے تھے ایسے کہ پڑھنے والا پڑھے اور بیساختہ زبان سے سبحان اللہ نکل جائے، پڑھنے والوں کو پورے ہفتے اس کا انتظار رہتا تھا ایسی دل کش، دل پذیر اور منفرد انداز والی تحریر دیکھنے کو نہیں مل سکی ان کی سی آن بان والی تحریر ان کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی شخصیات پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور لکھتے رہیں گے تاہم ایسی تحریریں کم ہی ہوتی ہیں جو ذہنوں پر اپنا نقش چھوڑ جائیں اور تا دیر یاد رہیں۔

صحافت و انشاء پردازی کے شہ سوار مکرم و محترم جناب سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی کتاب ''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ'' بھی پڑھنے کا شرف مجھکو حاصل ہوا ہے اور خرد نوازی کی اس ادائے دل نوازی کو بھی میں نہیں بھول سکتا کہ شاہ جی مرحوم نے بطور خاص مذکورہ کتاب مجھے عنایت فرمائی اس کتاب میں اپنے مخصوص اور منفرد اور

خوبصورت اسلوب میں شاہ جی نے جو کچھ لکھا اس کی داد تو ارباب نظر نے دی ہے مجھ جیسے حقیر خادم قلم کا تبصرہ اس پر یہ تھا کہ شاہ جی اس کتاب کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی یہ ان کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ کسی شخصیت پر جب لکھا جائے تو اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کا سراپا اس طرح پردۂ ذہن پر مرتسم ہو گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور اس کی نمایاں خصوصیات تحریر کے آئینے میں جلوہ گر ہیں، شاہ جی مرحوم کے شاداب انداز نگارش میں یہ چیزیں بدرجہ اتم موجود ہیں میں نے مذکورہ کتاب کو نہ جانے کتنی بار پڑھا اور جب بھی پڑھا نیا لطف اور نئی لذت محسوس ہوئی صحافت اور انشاء پردازی میں تو شاہ جی مرحوم میر کارواں کی حیثیت میں نظر آتے ہی ہیں شخصیت نگاری میں بھی ان کی رئیس القلم ہونے کی حیثیت اور منصب سے انکار نہیں کیا جا سکتا انہوں نے بڑے بڑے لوگوں پر لکھا اور ایسے زندہ اور پختہ اور خوبصورت اسلوب میں لکھا کہ خود بھی بڑے بن گئے حسرت کا مقام یہی ہے کہ شاہ جی مرحوم گئے تو دل کو چھو جانے والا طرز تحریر بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

اردو زبان کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہر دور میں بہتر سے بہتر لوگ اس کی خدمت کرنے والے اس کی زلفیں سنوارنے والے اس کو نشو ونما دینے والے اس کو خوب سے خوبتر بنانے والے موجود رہے ہیں، اور اس کار خوب میں ہندو مسلم سکھ وغیرہ سب برابر کے شریک رہے ہیں سب کی متحدہ کوششوں سے آج یہ زبان بحمد اللہ بین الاقوامی حیثیت کی حامل ہو گئی ہے ادباء شعراء نقاد — ناول نویس صحافی ڈرامہ نگار مزاح نگار محققین وغیرہ نے اپنی اپنی تخلیقات و نگارشات سے اس زبان کو مالا مال کر دیا ہے اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ناسازگار حالات کے باوجود یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے منصوبہ بند مخالفتوں کے باجود اردو کے چاہنے والے اس کی خدمت کو آج ایک ضروری فرض سمجھ کر انجام دے رہے ہیں اس پس منظر میں وہ تذکرہ نگار مستحق تحسین قرار پاتے ہیں جو صلے اور ستائش کی تمنا

کئے بغیر اور اپنی تنگ دامنی کی آبرو کو نیلام کئے بغیر اپنے فرض کو نبھا رہے ہیں جو قلمی جہاد سے اردو کو سرخ رو اور سر بلند کرنیکی کوششوں میں مصروف ہیں۔

ایسے ہی ایک صالح نوجوان جو بحمد اللہ عالم بھی ہیں اور صاحب قلم بھی عزیز مکرم مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر ہیں وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں استعداد اور صلاحیت سے نوازا ہے انکا تعلق ایک علمی خانوادے سے ہے ان کے مقالات و مضامین معتبر اور مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے اور پسند کئے جاتے ہیں بہت اچھے خطیب بھی ہیں ان کے والد بزرگ وار ''بڑے شاہ جی'' جنکا تذکرہ اوپر کی سطور میں کر چکا ہوں قلم کے بادشاہ تھے عزیز مکرم اور ''چھوٹے شاہ جی'' ان کی علمی اور قلمی وراثت اور روایت کو بخوبی نہ صرف سنبھالے ہوئے ہیں بلکہ اس میں چار چاند بھی لگا رہے ہیں بحمد اللہ نوجوان ہیں ان کی تحریروں میں بھی جوانی کی ترنگ اور شباب کی جولانیاں نظر آتی ہیں۔

عزیز موصوف نے ماہنامہ ترجمان (دیو بند) میں شخصیات پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کو پڑھنے والوں نے بہت پسند کیا انہیں مضامین کو کتابی شکل میں لا رہے ہیں اشاعت و طباعت کا انہیں بہت اچھا تجربہ بھی ہے اور سلیقہ بھی توقع یہی ہے کہ تجربہ اور سلیقہ دونوں کتاب کے حسن اور معنویت میں انشاء اللہ اضافے کا موجب بنیں گے میں اپنے موضوع سے انصاف نہیں کروں گا اگر بساط سخن لپیٹنے سے پہلے ایک دو اقتباس مولانا موصوف کے مضامین سے پیش نہ کردوں۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، صاحب فضائل بزرگ سے متعلق انہوں مضمون لکھا تو مبنی بر حقیقت ان کے مناقب کو دل کش اسلوب میں اس طرح بیان کیا:

> ''تقریر میں ان کو جو انفرادیت حاصل ہے وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی، وہ شعلہ بیان مقرر اور پر جوش خطیب نہیں تھے مگر ان کے لہجے میں شہد کا سا مٹھاس، ان کے بیان میں پھولوں کی سی

خوشبو، ان کی گفتگو میں چاندنی کا حسن، اور دریاؤں کی سی روانی تھی، گھنٹوں بولتے نہ خود تھکتے اور نہ دوسرے اکتاہٹ کا شکار ہوتے، قرآن، حدیث، قصص وحکایات، آثار وواقعات، منطق وفلسفہ، حکمت ودانائی، علمی بصیرت وگہرائی، فقہ وادب، معانی وکلام سب کچھ ان کی تقریروں کا خاصہ تھا، اتنی لمبی اور طویل تقریروں میں نہ اٹکتے، نہ ٹھہرتے، نہ کھنکھارتے اور نہ اپنے موضوع سے دور ہوتے، ان کی تقریریں کیا تھیں ایک ایسا دلچسپ، دلآویز اور دلکش بیان، ''سنئے اور سر دھنئے'' کا مصداق''۔

بڑے شاہ جی مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی پوری زندگی اور سچائی کو انہوں نے کمال خوبی کے ساتھ ان چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا:

''جری اور بیباک تھے، نہ کسی ہنگامے سے گھبراتے اور نہ کسی خوف کا شکار ہوتے، مردانہ وار ہر دشواری کا مقابلہ کرتے، ان کے فلک شگاف قہقہوں کے نیچے کرب والم کی ہزار کہانیوں نے دَم توڑ دیا، کبھی بکھرے نہیں، کبھی ٹوٹے نہیں ہاں! آخری قضیہ میں وہ مضمحل ہو کر شکست کھا گئے، گو براہِ راست اس میں اُن کی شمولیت نہ تھی مگر جماعت کے انتشار نے ان کو توڑ کر رکھ دیا اور زندگی کی شام ہونے سے پہلے ہی اُن کے رات دن مایوسیوں اور دل شکنی کے اندھیروں میں ڈوب گئے اور ایسے ڈوبے کہ اگلے دن کا سورج پھر طلوع نہ ہوا اور وہ سویرا ہی نہ آیا جس کی تلاش میں آج بھی قافلے کے بچے کھچے افراد امیدوں کا دامن تھامے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور کسی خدائی مدد کی آس میں جن کی نگاہیں آسمان کا طواف کرتی رہتی ہیں''۔

المیۂ دیو بند سے جو لوگ اچھی طرح واقف ہیں اور ۲۳ سال قبل جو کچھ
یہاں ہوا اس پر جن افراد کی نظر ہے وہ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کے ان جملوں کا صحیح
لطف اٹھا سکتے ہیں جو انہوں نے حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب پر لکھے گئے مضمون
کے اختتام پر لکھے ہیں:

''عزم اور ارادہ ان کی زندگی کا حسین عنوان ہیں ایک طوفان بھی
ان کی زندگی میں آیا ایسا طوفان جس میں''۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

یہ طوفان تھا یا اپنی بقا کی جنگ یا معرکۂ کرب و بلا ان سب سے
زیادہ موزوں یہ کہ خود کو ٹوٹنے بکھرنے اپنے اور جماعت کے
وجود کو ریزہ ریزہ ہونے سے محفوظ رکھنے کا ایک مسلسل اور مستقل
عمل ہمیشہ روشنی کی تلاش رہی اور جب صدق وصفا کے چراغ
ہتھیلیوں پر سجا لئے تو یہ عمل

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعلہ اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلادیا

''ان پر لکھنے کے لئے بہت کچھ باقی اور زندگی کے دیگر پہلوؤں
پر خامہ فرسائی کے لئے دوسری صحبت بھی درکار ۱۹۲۸ء کو انہوں
نے عالم امکان کا پہلا جلوہ دیکھا اور تب سے آج تک علمی
عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ مناظر قدرت، مناظر فطرت،
مناظر عالم سے ان کا ذہن، ان کا قلب ان کی روح، ان کی
آنکھیں اکتساب نور کررہی ہیں''۔

بیان کا حسن، شخصی مناقب و فضائل کا ذکر، مسائل و حوادث کا اشخاص پر

پڑنے والے اثرات کا تجزیہ، چست اور برجستہ تراکیب استعارات کا خوبصورت استعمال یہ سب چیزیں صاحب تحریر کے سلیقۂ بیان پختہ شعور اور قلم و قرطاس سے ماہرانہ وابستگی کی شہادت دیتی ہیں کتاب کے جملہ مضامین میں یہی شان یہی آن یہی تیور اور یہی اجلاپن نظر آتا ہے، عزیز مکرم مولانا سید نسیم اختر شاہ جہاں اب ہیں وہاں سے بہت آگے جانے کی صلاحیت ان میں ہے احوال وکوائف مساعدت کریں تو یہ توقع انشاءاللہ ایک حقیقت ثابتہ بن جائے گی۔

میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں بیش از بیش قیمتی صلاحیتوں سے کام لینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

قمر عثمانی

۵/جنوری ۲۰۰۵ء

میرے عہد کے لوگ

محترم ڈاکٹر تابش مہدی صاحب ایم،اے، پی ایچ ڈی

عزیز گرامی مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصؔر ایک ذی علم، سنجیدہ اور فعال عالم دین اور صالح فکر و شگفتہ رقم اہل قلم ہیں۔ ذہانت و فطانت شرافت و نجابت، سنجیدگی و صالحیت اور علم وقلم کی دولت انہیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کے جدّ محترم حضرت علاّمہ سید انور شاہ کشمیریؒ سے ایک جہانِ علم واقف ہے انہیں حدیث و تفسیر میں امامت کا درجہ حاصل رہا ہے ان کے والد محترم مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر اپنے عہد کے مسلم الثبوت ادیب وصحافی تھے وران کے عم محترم مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری حدیث وتفسیر میں مقام اختصاص رکھتے ہیں ہندو پاک کا ایک بڑا مذہبی حلقہ ان کے علم وفہم اور درس وخطابت کا گرویدہ ہے۔

مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر نے بہت کم عمری میں قرطاس وقلم سے اپنا رشتہ استوار کرلیا تھا۔ میں نے پہلی بار ماہ نامہ ''رگِ سنگ'' کان پور کے صفحات میں ایک مضمون نگار کے طور پر ان کا نام اس وقت دیکھا تھا جب وہ دارالعلوم دیو بند کی کسی ابتدائی جماعت میں زیر تعلیم تھے اسی وقت سے ان سے تعلق خاطر ہو گیا تھا، اس لیے کہ میں اس وقت کے ایک کم عمر طالب علم سید نسیم اختر شاہ قیصر کو مستقبل کے ایک

بڑے عالم اور قلم کار کے طور پر دیکھ رہا تھا الحمد للہ میرا اس وقت کا اندازہ صد فی صد درست نکلا وہ دارالعلوم (وقف) دیوبند کے ایک محنتی، مقبول اور ہر دل عزیز استاذ ہیں اور ملک کے موقر و معتبر رسائل و جرائد میں مختلف موضوعات پر آئے دن ان کے علمی ادبی اور مذہبی مضامین و مقالے شائع ہوتے رہتے ہیں موضوع کا تنوع اور لہجے کی شائستگی ان کی شناخت ہے وہ جب اور جس موضوع پر لکھتے ہیں پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ لکھتے ہیں موضوع کا حق ادا کرتے ہیں اور ان کا ہر مضمون ان کی اس سنجیدگی اور متانت کا آئینہ دار ہوتا ہے جس کی بجا طور پر ان سے توقع کی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب ''میرے عہد کے لوگ'' عزیز گرامی مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر کے شخصیاتی مضامین اور مقالات کا دل کش و دل آویز مجموعہ ہے۔ یہ مضامین اور مقالات کبھی مرحوم شخصیتوں کے سانحۂ وفات سے متاثر ہو کر لکھے گئے، کبھی ان کے وابستگان اور منتسبین کی فرمائش پر اور کبھی بعض رسائل و جرائد کے تقاضوں پر یہ تمام مضامین کسی نہ کسی نوع سے اہم و قابل ذکر رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں ان شخصیتوں میں اپنے عہد کے مذہبی و روحانی پیشوا بھی ہیں اور علماء و فقہا بھی اور صحافی، دانشور اور شعراء و ادباء بھی ان شخصیات کی خوش نصیب فہرست میں ہمیں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے بیسویں صدی عیسوی کے اعاظم رجال بھی ملتے ہیں اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مفتی مظفر حسین اور مفتی محمود حسن گنگوہی جیسے عالم و فقیہ بھی اور علامہ انور صابری، سید محبوب رضوی، مولانا عامر عثمانی، مولانا سید اظہر شاہ قیصر، جمیل مہدی، حفیظ میرٹھی اور ساحل فریدی جیسے مجاہدین قلم و صحافت اور صاحب طرز شعراء بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ ان شخصیتوں پر لکھتے وقت نسیم اختر شاہ قیصر نے مثبت رویہ اختیار کیا ہے ان کے انہیں

پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو مثبت اور تعمیری ہیں ان پہلوؤں سے یکسر پہلو تہی کی ہے جو کسی طبقے کے لیے دل آزاری کا سبب بن سکتے ہوں حالانکہ ان میں بعض شخصیتیں اپنے اپنے دور میں خاصی متنازع رہی ہیں میں ان کے اس رویے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

''میرے عہد کے لوگ'' میں ایک مضمون مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پر ہے یہ مضمون کچھ دنوں پہلے مالیر کوٹلہ پنجاب سے شائع ہونے والے رسالے ''دارالسلام'' میں بھی نظر سے گزرا تھا اس کی یہ سطور پڑھ کر حضرت مفتی صاحب کا سراپا سامنے آ گیا:

> ''مفتی صاحب کی ''جی ہاں'' بہت معنی خیز تھی جب وہ ''جی ہاں'' کہتے تو ادائیگی کے آہنگ سے ہی اس کی معنویت سامنے آجاتی کبھی یہ ''جی ہاں'' قلب وجگر کو چھیدتی ہوئی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی، کبھی سلگتے اور تپتے ہوئے ماحول میں بارش کے چھینٹوں کا کام کرتی، ناخوش گوار مواقع پر اس ''جی ہاں'' کا مفہوم ہی بدل جاتا جی ہاں سے کبھی تائید ہوتی کبھی تنقید مخاطب ہی اس کی صحیح سمت متعین کرسکتا تو کر لیتا ہر ایک کے لیے اس کے رخ اور منشاء کا اندازہ لگالینا مشکل تھا''۔

اس تحریر سے جہاں ایک طرف حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی پہلو دار شخصیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے، وہیں شخصیت نگار کا یہ وصف بھی سامنے آتا ہے کہ وہ کس گہرائی کے ساتھ شخصیتوں کا مطالعہ کرتا ہے اور اسکے حرکات، سکنات اور جملوں سے معانی ومطالب اخذ کرتا ہے اپنے اسی مضمون میں نسیم اختر شاہ نے لکھا ہے:

> ''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس دور کے ایک ایسے انسان کو دیکھا ہے جس پر ہماری تاریخ ملت کو فخر ہے اور جو

اپنے خلوص، محبتوں، چاہتوں، فکر و تدبر، خوش اخلاقی و خوش
مزاجی، متانت اور بردباری، تحمل اور رواداری رعایت و مروت
لحاظ اور پاس داری اور خردنوازی و خودداری میں یکتا و منفرد تھا۔
وہ (مفتی صاحب) اپنے لباس، حلیے اور رکھ رکھاؤ کسی زاویے
سے بھی بڑے انسان نظر نہیں آتے تھے حالانکہ ہر صورت میں
وہ بڑے تھے اور یہ بڑا نظر نہ آنا ہی ان کی عظمت اور بڑائی کی
دلیل ہے''۔

ان سطروں سے علماء، زعماء اور بزرگوں سے مضمون نگار کی نیازمندی اور ذہنی و مزاجی انسلاک کی نشان دہی ہوتی ہے میں اسے ان کی صالحیت اور سلامتیٔ طبع تصور کرتا ہوں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ اپنے عہد کے ایک بڑے انسان تھے۔ ان کی عظمت و بلندی اور جزرسی و معاملہ فہمی کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں اور میں بھی اس بات پر نازاں و شاداں ہوں کہ میں نے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ جیسی عبقری شخصیت کو دیکھا ہے لیکن جس باریکی، جزرسی اور مثبت زاویۂ نگاہ سے عزیز گرامی مولانا نسیم اختر شاہ نے ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے وہ انہیں عام لکھنے والوں میں ممتاز و نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے یہی شخصیت نگاری کا کمال بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''میرے عہد کے لوگ'' کے تمام مضامین اپنے مضمون نگار کی ذہانت، ذکاوت، صالحیت اور وسعت فکر و نظر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ مضامین قاری کو بعض ایسی مقتدر ہستیوں کی مجالس تک لے جاتے ہیں جنہیں بیسویں صدی کا سرمایۂ افتخار تصور کیا جاتا ہے۔ یقیناً ان مضامین کے مطالعے سے قاری کے اندر خیر و فلاح اور نیکی و تقویٰ کا جذبہ پروان چڑھے گا، علم و دانائی اور شعر و ادب سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور اپنی تہذیبی و ثقافتی روایات سے اس کا رشتہ مستحکم ہوگا۔

میں ''میرے عہد کے لوگ'' کی اشاعت پر اپنے عزیز بھائی مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا اشہب قلم خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا تاکہ عظیم و تاریخ ساز شخصیتوں کے حوالے سے علم و حکمت، ادب و تہذیب اور فکر و دانائی کے نئے نئے گوشے دریافت ہوتے رہیں۔

تابش مہدی

چیرمین ادبیات عالیہ اکادمی

جی ۵/اے۔ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کچھ صاحبِ تصنیف اور اس کی تصنیف کے متعلق

محترم ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب

امام العصر، محدث وقت، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی علمی شہرتوں کا جو سفر بیسویں صدی میں عروج پر تھا اس میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح تسلسل باقی رکھا کہ ان کے بڑے صاحبزادے سید ازہر شاہ قیصر کو بھرپور تحریری صلاحیتیں ودیعت کیں جنہوں نے اپنے قلم سے اسی صدی کے آٹھویں دہے تک ایک زمانہ کو فیض یاب کیا، ان کی تحریریں عوام وخواص میں یکساں مقبول ہوئیں۔ دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مدظلہ العالی اپنی تقریری صلاحیتوں کا اعتراف اپنوں اور غیروں، رفیقوں ورقیبوں میں مستقل کرا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے زمانہ کو اور زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ اور پھر علمی و مذہبی حلقوں میں ان کی شہرت مستزاد۔

الحمد للہ اسی خانوادے کے ہونہار فرزند ابن الازہر سید نسیم اختر شاہ قیصر ہیں جنہوں نے اپنی خوبصورت تحریروں سے گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں نام

روشن کیا اکیسویں صدی میں بھی ان کا قلم جلوہ ریز ہے۔ اور نثر کے ہر میدان میں طبع آزمائی کے باعث صحافتی حلقوں میں انکی تحریریں مقبول ومحبوب ہیں الفاظ کو غلامی میں لینے کا ملکہ نسیم اختر شاہ کو وراثت میں ملا ہے۔ حسین ترین الفاظ، خوبصورت جملے، دل کش عبارات، عمدہ تعبیرات، نادر استعارات وتشبیہات کو ایک لڑی میں پروکر مضمون مکمل کر دینے میں انہیں مہارت تامہ حاصل ہے جس کی وجہ سے قاری کو ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا'' کا احساس ہونے لگتا ہے۔

مجھے نسیم اختر کی ہم عصری وہم درسی کے ساتھ ساتھ رفاقت ودوستی کا اعزاز حاصل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ٹوٹی پھوٹی بے ربط تحریریں لکھنے کا حوصلہ ان کی پختہ تحریروں کو دیکھ کر ہی ہوا۔ ان کے تمام اوصاف وکمالات کے پیش نظر میں صد فیصد یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں مخلصانہ طور پر دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر سنجیدگی ومتانت کے ساتھ لکھتے ہیں یوں تو انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن شخصیات پر لکھنے میں انہوں نے اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ پیش نظر کتاب ''میرے عہد کے لوگ'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے شخصیات پر لکھنے کی رسم بھی اگرچہ انہیں اپنے مرحوم والد کے ترکہ میں ملی ہے لیکن اسے انہوں نے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے ان کا خصوصی وصف زندہ جیتی جاگتی شخصیات پر لکھنا ہے جو ان کی زندہ دلی کی روشن علامت ہے۔

قدیم مرصع ومقفیٰ عبارتوں کو جدید رنگ دیکر انہوں نے جس سہل انداز سے پیش کیا ہے اس نے انہیں صاحب فن ادباء کی فہرست میں جگہ دے دی ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں جو قاری کا تعلق براہ راست شخصیت سے قائم کر دیتی ہیں اور قاری کو ایک خاص لذت حاصل ہونے لگتی ہے زمانہ قحط الرجال کے جن حالات سے دو چار ہے اسے انہوں نے کسی خوبصورت انداز سے سمودیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

محرومیوں کا سلسلہ دراز ہے اور مایوسیوں نے پوری طرح پاؤں پسار رکھے ہیں علم وعمل کی دنیا میں ایک اور خلا پیدا ہوا، حکمت و دانائی کا ایک اور ستارہ آسمان سے ٹوٹا ایک اور شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ بھی رمضان کے مقدس مہینے اور آخری مسعود عشرہ میں واصل بحق ہوگئے، کہنے والے یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ ایک بلند انسان رخصت ہوگیا اور لکھنے والے یہ لکھ کر مطمئن ہوجائیں گے کہ ان کی کمی پوری نہ ہوسکے گی، لیکن یہ سچ ہمیشہ سچ ہی رہے گا کہ مفتی صاحبؒ کی صورت میں فکر وعمل، تقویٰ و پرہیز گاری، صدق و امانت، خشیت وللٰہیت کی جو ہفت رنگ اور نورانی مجلس جمی ہوئی تھی وہ بے رونق ہوگئی، وہ شمع گل ہوگئی، جس کی روشنی پاکیزگیٔ کردار، پاکیزگیٔ اخلاق اور پاکیزگیٔ معاملات کو جلا بخشتی اور اس راہ کے سناٹوں کو چیرتی ہوئی بہت دور تک پہنچتی تھی۔

سہارنپور سے تعلق رکھنے والے ساحل فریدی مرحوم اس دور کے بہترین استاد شعراء میں سے تھے ان کی وفات نے نسیم صاحب کی حساس طبیعت کو بے چین کردیا۔ ان کے بارے میں انہوں نے جو تحریر سپرد قلم کی اس کا خوبصورت انداز ملاحظہ فرمایئے:

''ساحل صاحب کو خدا نے بیشمار خصوصیات سے نوازا تھا سہل اور آسان زبان میں گفتگو، تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں پختگی، درد اور غم کے بیان میں مہارت، سماجی اور معاشرتی رشتوں پر نگاہ، انسانی کرب اور الم کی داستان، بکھرتے ٹوٹتے احساسات کی ترجمانی، مانوس لب ولہجہ، نازک تعبیرات اور تاریخی حوالوں

سے ان کی شاعری کی شناخت قائم ہوئی، یہ شناخت ساحل کے
اندر چھپے انسان کا پتہ دیتی ہے، ایک ایسا انسان جس کی روح
نظیف اور جس کے خیالات صاف وشفاف تھے''۔

(ماخوذ از سفر تمام ہوا۔ ساحل فریدی)

حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندیؒ اپنے وقت کے جید عالم دین اور انتہائی قابل قدر شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن زمانہ نے ان کی خدمات کو فراموش کر دیا۔ نئی نسل انکے نام سے بہت کم آشنا ہے، ان پر جتنا کچھ لکھا جانا چاہیے تھا وہ نہیں لکھا جا سکا۔ نسیم اختر صاحب نے نامور شخصیات میں ان کا بھی تذکرہ شامل کیا ہے۔ حالاں کہ ہم دونوں کو ہی مولانا شریف حسن صاحب مرحوم سے شرف تلمذ حاصل نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کی با کمال، و جمال اور بارعب شخصیت کا اثر ابھی تک ذہنوں میں محفوظ ہے اس تذکرہ کی تمہید ی سطور میں انہوں نے نہ صرف مولانا شریف حسن صاحب مرحوم کو بلکہ پورے دیوبند کو جس انداز سے خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

''دیوبند کو خداوند عالم نے جن علمی عظمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ تاریخ کا حصہ بھی ہیں، حال کا بیان بھی اور باوقار مستقبل کا آئینہ بھی، یہاں کی خاک سے وہ اہل علم اور مرد مجاہد پیدا ہوئے جو مسلمانان ہند کی زندگی میں بنیادی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں یہ خوش فہمیوں کا ابتلا نہیں، بلکہ حقائق کی وہ روشنی ہے، جو دور تک بہت دور تک بلکہ آخری حدود تک پھیلی ہوئی ہے، اندھیرے سراسیمہ اور خوف زدہ ہیں اور تاریکیاں ان کے قدموں کی چاپ سنتے ہی اپنا راستہ بدل دیتی ہیں، دیوبند کا یہ امتیاز اول دن سے آج تک باقی ہے اخلاص وللہیت کی بستی میں

علم وکمال کی آبادی میں اور فکر ونظر کی فصیلوں پر جب تک یہ
چراغ جلتے رہیں گے چھ حرفی لفظ "دیو بند" ہمیشہ چمکتا رہے گا۔
(ماخوذ از تذکرہ مولانا شریف حسن صاحبؒ)

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مدظلہ العالی کے تذکرہ کے ذیل میں الفاظ کی بندش کی یہ چستی حقیقت حال کا اظہار بھی ہے اور نسیم اختر شاہ صاحب کی قلمی مہارت بھی فرماتے ہیں کہ:

"الفاظ شاہ صاحب کے اردگرد پروانوں کی طرح پوری وارفتگی، پورے جذبے کے ساتھ چکر لگاتے ہیں، کب ان کی نظر کرم ہو اوران کی نوک قلم اورنوک زبان سے ادا ہونے کی سعادت حاصل ہو، علوم کا گنجینہ، معلومات کا خزینہ ان کے مواعظ اور خطبات کی شان ہی نرالی ہے، ابوالکلام آزاد کی سحر انگیز خطابت، عطاء اللہ شاہ بخاری کی گھن گرج، حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا استدلال، حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی مہارت، شبیر احمد عثمانی کی طلاقت لسانی نے اگر کہیں ٹھکانا بنایا تو وہ شاہ صاحب کی ذات ہے"۔

(تذکرہ انظر شاہ صاحب)

نعیم صاحب کا ایک خصوصی وصف مضمون کو بہت دل چسپ انداز سے پایۂ تکمیل کو پہنچانا ہے۔ تقریباً سبھی شخصیات کے تذکرہ کا اختتام انہوں نے اسی انداز سے [illegible] ہے جو ان کا اپنا منفرد اور اچھوتا انداز ہے مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے تذکرہ کے آخری پیراگراف کی جامعیت ودل کشی قابل توجہ ہے فرماتے ہیں:

"... [illegible] ۱۹۰ [illegible] کو مفتی صاحب نے [illegible] آسمان کی پہلی جھلک [illegible] ۱۹۹ [illegible] کو دن کے ساتھیوں کی [illegible] ور ٹوٹ

گئی، اب جنوبی افریقہ کا دور افتادشہر خموشاں انکامدفن ہے ان کی بلند و بالا شخصیت ان کا عظیم اور قابل ذکر کردار، ان کا علم وعمل، ان کی صالح اور لائق تقلید زندگی، اَن کا تقوئی اور پرہیز گاری ان کی فراخ دلی اور سخاوت کے ہزاروں قصے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے لیے نمونۂ عمل ہیں، ان کی ضرورت گذرنے والے کل میں جتنی تھی اس سے زیادہ کہیں آج ہے اور آنے والے کل میں اس کا احساس زیادہ ہوگا۔

(ماخوذ از تذکرہ مفتی محمود حسن صاحبؒ)

المختصر نسیم اختر صاحب کی تازہ تصنیف ان کے فنی جواہر پاروں میں مزید نکھار لے کر آئی ہے، قارئین و ناظرین اس کے مطالعہ و مشاہدہ سے نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ استفادہ بھی کریں گے۔ کم از کم میں نے تو یہ محسوس کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ موصوف کی اس تصنیف کو شرف قبولیت سے نوازیں اور ''شخصیات'' کے جن صالح اوصاف کو انہوں نے اجاگر کیا ہے اسے قبول فرمائے۔ اور قارئین کو توفیق دے کہ وہ ان مضامین کو نمونۂ عمل بنائیں۔ آمین

عبید اقبال عاصم

علیگڈھ

۲؍جنوری ۲۰۰۵ء

مُقدِّمۃ

محترم مولانا ندیم الواجدی صاحب
مدیر ماہنامہ ''ترجمانِ دیو بند'' دیو بند

معروف عالم دین اور صاحب قلم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی نئی کتاب ''میرے عہد کے لوگ'' کا مسودہ راقم السطور کے زیر مطالعہ ہے، موصوف نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ اظہار خیال کروں۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مصنف کے عہد میں موجود یا رخصت پذیر لوگوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے، ان لوگوں میں اہل علم بھی ہیں، ارباب قلم بھی ہیں، صحافی اور دانشور بھی ہیں اور شاعر بھی۔ زیادہ تر اُن بزرگوں پر مضامین لکھے گئے ہیں جن کو مصنف نے قریب سے دیکھا ہے یا ان سے استفادہ کیا ہے، یہ کل بیس شخصیات ہیں۔ ایک دو کو چھوڑ کر تمام شخصیتوں کا تعلق دارالعلوم دیو بند سے ہے یا اس سرزمین سے جس پر دارالعلوم قائم ہے، ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ، فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ باندویؒ جیسے بزرگانِ دین، حضرت مولانا محمد میاں دیو بندیؒ، حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ، حضرت مولانا عامر عثمانیؒ اور حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ جیسے اصحاب قلم اور مصنف، حضرت مولانا شریف حسن دیو بندیؒ، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہ، حضرت مولانا سیّد انظر شاہ کشمیری زید مجدہم جیسے ماہرین تدریس و تعلیم، جناب سیّد ازہر شاہ قیصر، جناب سید محبوب رضوی اور جناب جمیل مہدی جیسے صحافی اور دانشور، علامہ انور صابری، ساحل فریدی، صادق صابری، حفیظ میرٹھی، مفتی کفیل الرحمٰن نشاطؔ اور مولانا قمر عثمانی جیسے شاعر شامل ہیں۔ اس طرح یہ

کتاب ایسی شخصیتوں کا مرقع بن گئی ہے جن کا میدان عمل اگرچہ مختلف تھا، مگر جن کی فکری جہتیں مشترک تھیں۔

''میرے عہد کے لوگ'' کا مرکز ومحور ایک ایسی سرزمین ہے جو وسیع تر ہندوستان کے نقشے میں ایک نقطے سے بھی کم حیثیت رکھتی ہے، یہ گمنام اور معمولی قصبہ اب سارے عالم میں دیوبند کے نام سے مشہور ہے اور دارالعلوم دیوبند کے قیام نے اس کو عظمت وتقدس کا وہ لباس پہنا دیا ہے جو تا قیامِ قیامت اس کے سراپا کی زینت بنا رہے گا، مضمون نگار نے اسی سرزمین کی ممتاز شخصیتوں کے خدوخال اپنے قلم سے صفحۂ قرطاس پر ابھارنے کی کوشش کی، وہ یہیں پیدا ہوئے، ان کا بچپن یہاں گزرا، جوانی کے شب وروز بھی اسی جگہ گذر رہے ہیں، آسمان دیوبند کے آفتاب وماہتاب کی ضیا باریوں سے اُن کا متاثر ہونا کچھ حیرت کا باعث نہ ہونا چاہیے۔ حیرت اس وقت ہوتی جب وہ اپنے گھر کی روشنی سے آنکھیں بند کرکے دوسرے گھروں میں اجالے تلاش کرنے نکلتے، حق بات یہ ہے کہ علمائے دیوبند سے متاثر ہونا اور ان کے فضل وکمال سے اپنے قلم کو زینت دینا مضمون نگار کی صالحیت اور سلامتیٔ طبع کی دلیل ہے۔ میں صاحب کتاب کو ان کے اس اقدام پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

سوانح نگاری ہمیشہ سے ایک پسندیدہ اور دلچسپ موضوع رہا ہے، ہر دور میں اہل قلم نے اپنے پیش رو بزرگوں کے حالات قلم بند کیے اور ان پر اپنے تاثرات اور مشاہدات لکھے، یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی لائبریری ہر دور کے مفسرین، محدثین، فقہاء، ادباء، علماء، صوفیاء اور سلاطین کے تذکروں سے بھری پڑی ہے، اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو آج ہم نہ صحابۂ کرامؓ کے حالات سے واقف ہوتے، نہ تابعین کی زندگی کے روشن نقوش ہمارے سامنے ہوتے، نہ ہمیں بعد میں آنے والے بزرگوں کے کارناموں سے کوئی رہنمائی ملتی، ایک طرح سے پوری تاریخ ہی ہماری نظروں سے

اوجھل ہو جاتی، تاریخ صرف جنگ و جدال کے واقعات اور سلطنت وحکومت کے عروج و زوال کی داستان ہی نہیں بلکہ ان اصحاب فکر و عمل کے کارناموں کا روشن عنوان بھی ہے جو ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور خلق خدا کی فکری اور عملی رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر یہ تذکرے نہ ہوتے تو ہمیں یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ صحابۂ کرامؓ نے کس طرح دین کی اشاعت کے لیے جدوجہد کی ہے اور کس طرح حجاز مقدس سے نکال کر اسے براعظم افریقہ، ایشیاء اور یورپ کی دہلیز اندلس تک پہنچایا ہے، کس طرح تابعین نے، تبع تابعین نے اور بعد کے بزرگوں نے صحابہ کرامؓ سے ملی ہوئی وراثت کو متاع عزیز کی طرح سنبھال کر رکھا۔ قرآن کریم کی تفسیریں لکھیں، احادیث شریفہ کو مدون کیا، فقہی احکام کا استخراج کیا، تفسیر حدیث اور فقہ کے اصول مرتب کیے، ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ چودہ صدیوں پر محیط اس مدت میں کتنے آفتاب اور ماہتاب آسمان رشد و ہدایت اور علم و عمل پر روشن ہوئے ہیں اور کتنے لوگوں نے مخلوق خدا کے دلوں کو اپنے فیض سے منور کیا ہے۔

دین اسلام کی اشاعت اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کی یہ تمام داستانیں اور یہ تمام قصے ہمیں تذکروں اور سوانحی ادب کی کتابوں میں ملتے ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے مؤرخوں، سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کو کہ ان کی بدولت آج ہماری علمی، دینی، اصلاحی اور فکری تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ہماری تاریخ کا کون سا صفحہ ہمارے کس بزرگ کے اعمال صالحہ سے منور اور معطر ہے۔ آج ہمیں اپنی تاریخ کے ان کرداروں پر فخر ہے۔ جن کو دنیا امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور احمد ابن حنبلؒ جیسے فقیہ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ابن ماجہؒ، امام بیہقیؒ جیسے محدث، امام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ، ملا علی قاریؒ، زیلعیؒ جیسے شراح حدیث، ابن حزمؒ، ابن حبانؒ، ابن عبدالبرؒ اور سیوطیؒ جیسے مصنف، امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن القیمؒ، ابن الجوزیؒ، فخر الدین رازیؒ،

قاضی عیاضؒ، خطابیؒ اور بغویؒ جیسے عالم اور مفسر، طبریؒ، ابن کثیرؒ، ابن الاثیرؒ، ابن خلکانؒ جیسے مؤرخ کی حیثیت سے جانتی ہے، ذرا سوچیے اگر ان محسنین امت اور ان جیسے ہزاروں اصحاب علم وعمل کے تذکرے کتابوں میں نہ ملتے تو بعد میں آنے والی نسلوں کا کیا حال ہوتا؟

عربی میں بزرگوں کے تذکروں پر مشتمل بے شمار کتابیں ہیں جن میں سے بعض کئی ضخیم جلدوں میں ہیں اور آج مراجع ومصادر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حافظ ابن عبد البرؒ کی ''الاصابہ فی تمییز الصحابہ'' (۹ جلدوں میں) حافظ ابن القیمؒ کی ''اعلام الموقعین'' (۴ جلدوں میں) ابن الاثیرؒ کی ''اسد الغابہ'' (۸ جلدوں میں) جاحظ کی ''البیان والتبیین'' (دو جلدوں میں) ابوالفرج الاصفہانی کی ''کتاب الاغانی'' (۱۳ جلدوں میں) سہیلی کی ''الروض الانف'' (ایک جلد میں) ابن قتیبہ کی ''الشعر والشعراء'' (ایک جلد میں) ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' (۴ جلدوں میں) ایسی ہی معرکۃ الآراء کتابیں ہیں، جن میں صحابۂ کرام، بزرگان دین، مفسرین، فقہاء محدثین، ادباء اور شعراء کے قلمی خاکے بکھرے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی تذکرہ نگاری یا شخصیتوں سے متعلق تاثراتی مضامین تخلیق کرنے کی روایت نئی نہیں ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی ''اخبار الاخیار'' غلام علی آزاد بلگرامی کی ''مآثر الکرام'' اور ''سبحۃ المرجان'' اور علامہ حکیم عبدالحیؒ لکھنوی کی ''نزہۃ الخواطر'' جو بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اسی قبیل کی کتابیں ہیں، عربی زبان سے یہ روایت اُردو میں بھی در آئی ہے۔ ماضی قریب میں بہت سے اصحاب قلم نے اس موضوع پر بڑی قیمتی اور دلچسپ کتابیں لکھی ہیں جیسے بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسان رفتہ'' مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''حکیم الامت نقوش وتأثرات'' ماہر القادری کی ''یادرفتگاں'' حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی ''دارالعلوم دیوبند کی

پچاس مثالی شخصیات'' مولانا علی میاں ندویؒ کی ''پرانے چراغ'' جناب سیّد از ہر شاہ قیصر مرحوم کی ''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ'' مولانا سیّد انظر شاہ صاحب مدظلہٗ کی ''لالہ و گل'' مولانا محمد تقی عثمانی کی ''نقوش رفتگاں'' وغیرہ اُردو ادب میں تذکرہ نویسی اور تأثراتی مضمون نگاری کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ''میرے عہد کے لوگ'' اسی سلسلۃ الذہب میں ایک اور سنہری کڑی جوڑنے کا خوبصورت عمل ہے اور اس سے اُردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہوا ہے، اس کتاب کے اکثر مضامین ماہنامہ ''ترجمانِ دیو بند'' اور دوسرے رسائل و جرائد میں چھپ کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کو ایک مجموعہ کی شکل دی جاتی، مولانا نے بہت اچھا کیا کہ ان کو کتابی شکل میں چھاپنے کا ارادہ کرلیا، ورنہ رسائل و جرائد میں چھپے ہوئے مضامین کی زندگی کچھ زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔

یہ مضامین محض تأثراتی ہیں، شخصیتوں کی مکمل سوانح یا ان کے حالاتِ زندگی کے مکمل احاطے کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھے گئے ہیں، یہ محض مشاہدات کی مدد سے قلبی واردات و تاثرات کا اظہار ہے، ان کو کسی شخصیت کے تمام احوال کا مرقع سمجھنا غلط ہوگا، مضمون نگار نے ان شخصیات پر قلم اُٹھایا ہے جن سے اس کو عقیدت و محبت رہی ہے، یا جن سے اس نے اپنی زندگی میں کم یا زیادہ استفادہ کیا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مضمون نگار نے جن شخصیتوں پر قلم اُٹھایا ہے صرف وہی اس کے دائرۂ عقیدت میں شامل تھیں، مزید کوئی شخصیت نہ اس کے نزدیک محبوب و محترم ہے اور نہ اس لائق کہ اس پر کچھ لکھا جائے، میرا خیال ہے کہ مصنف نے دیوبند جیسی علمی جگہ میں رہ کر اور علمی خاندان سے نسبی تعلق کی بنیاد پر ان جیسی بے شمار شخصیتوں کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور اسے ان سے استفادہ کرنے کا بھی موقع ملا ہے، ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ مضمون نگار کا قلم اسی مجموعۂ مضامین پر اکتفاء نہیں کرے گا، بلکہ اس رواں دواں

قلم سے دوسرے بزرگوں پر بھی اسی طرح مضامین لکھے جائیں گے۔

اس مجموعۂ مضامین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں صرف انہی شخصیتوں کو جگہ نہیں دی گئی جو دنیا سے رحلت کر چکے ہیں بلکہ زندہ شخصیتوں پر بھی لکھا گیا ہے، ورنہ عموماً اس طرح کے مضامین شخصیتوں کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد لکھے جاتے ہیں، زندگی میں کسی شخصیت پر لکھنے کا رواج بہت کم ہے، حالاں کہ زندہ بزرگوں پر لکھنے کے منجملہ فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ پڑھنے والے اس کے فضل وکمال سے بہ سہولت استفادہ کر سکتے ہیں جب کہ مرنے والے کے تمام فضائل وکمالات اس کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں اور بہ ظاہر ان سے استفادے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے، زندہ لوگوں پر لکھنے میں لوگوں کو تأمل اس لیے رہتا ہے کہ بعض کوتاہ بیں اس عمل کو تملق یا چاپلوسی کا نام دے کر بے فیض بنانے کے درپے رہتے ہیں، حالاں کہ کسی شخص کی مدح سرائی اگر وہ واقعی اس کا مستحق ہے نہ صرف یہ کہ ان حقیقتوں اور سچائیوں کا اعتراف ہے جس سے وہ شخصیت مرصع ہے، بلکہ متلاشیان حق کے لیے اندھیروں میں ایک منارۂ نور تعمیر کرنے کی کوشش بھی ہے۔

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اُردو کے ان خوش نصیب اصحاب قلم میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جو کم از کم پچیس تیس برس سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور اپنی علمی وادبی خدمات کی بناء پر اعتماد واعتبار کی دولت حاصل کر چکے ہیں، ان کے یہاں خیالات کی پختگی، زبان کی روانی اور ادب کی چاشنی کا خوب صورت امتزاج ہے، ان کے مضامین گہری فکری بصیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، زبان کی لطافت اور فکر کی سلامتی ان کی افادیت میں چار چاند لگا دیتی ہے، ان کی تربیت خالصتاً دینی پس منظر میں ہوئی جس نے ان کے فکر ونظر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے، کسی بھی شخص کے لیے اس کی تعلیم کے بعد جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کا تربیتی ماحول ہے جو اسے خاندان سے وراثت میں ملتا ہے، پھر وہ جذبہ ہے جو اس کے قدم کو خوب سے خوب تر کی جستجو کے لیے ہر لمحہ

آگے بڑھتا رہتا ہے، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو دینی تعلیم بھی ملی، اچھا علمی ماحول بھی ملا اور وہ جذبہ بھی خدا تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت فرمایا جو کسی بھی انسان کو رواں دواں متحرک اور فعال رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اچھا لکھتے ہیں بلکہ اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں، جرأت اور سلیقہ کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔

اس کتاب کا ہر مضمون صاحب تحریر کی فکری جولانی، وسعت نظری اور قوت اظہار کا ایک مکمل نمونہ ہے، ان کا قلم جو بچپن میں سرگرم نگارش ہوا تھا ابھی تک مسلسل گہر افشانی کرتا نظر آتا ہے، بلکہ اس میں کچھ زیادہ ہی تیزی، طراری اور بانک پن آ گیا ہے۔ وہ حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ محو نگارش ہیں، مختلف سیاسی، علمی، دینی اور ادبی موضوعات پر ان کے قلم کی گردش ہر لمحہ جاری ہے۔ اور ابھی وہ منزل بہت دور ہے جہاں راہی تھک کر بیٹھ جاتا ہے، قدرت کو ان کے قلم سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے۔

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر ایک خاص اسلوب نگارش رکھتے ہیں، ان کے مضامین کے متعلق بلا جھجک یہ رائے دی جاسکتی ہے کہ ان میں داخلی قوت استدلال کے ساتھ زبان کی شگفتگی اور برجستگی کے علاوہ استعارات اور تشبیہات کی رعنائی بھی ہے، وہ سادہ سادہ سی بات کو اس قدر دلکش اور دلفریب انداز میں کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذوق لطیف اسے فوراً قبول کر لیتا ہے، وہ خشک مضمون کو بھی زبان کی لطافت سے اس طرح رنگین بنا دیتے ہیں کہ قاری کی نگاہ میں دور تک فکر و خیال اور لفظ و معنٰی کے خوبصورت پھول کھلنے لگتے ہیں، اس مجموعۂ مضامین کے مطالعہ سے قارئین خود میرے اس دعوی کی صداقت کا اعتراف کریں گے، میں یہاں صرف ایک اقتباس دینا چاہوں گا جو حضرت مولانا محمد نعیم صاحب پر لکھے گئے مضمون کا ایک چھوٹا سا پیراگراف ہے۔ مضمون کا عنوان ہے ''علم و کمال کا مظہر، روایات اکابر کا عنوان، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب''

''حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دامت برکاتہم قدیم طرز اور انداز کے وہ انسان ہیں، سادگی جن کی فطرت کا حصہ، نفاست اور پاکیزگی جن کا

مزاج، خاموشی اور متانت جن کا سرمایہ، کردار وعمل کی پختگی جن کی شناخت، علم وفضل کی عظمتیں جن کے ہمرکاب رہتی ہیں، مطالعہ میں ایسا انہماک اور درس میں اتنا استغراق سنا تو ہے دیکھا صرف ان کے یہاں، استعداد ان کی ایک مثال، علوم عقلیہ ونقلیہ پران کی گرفت مکمل، تفسیر وحدیث میں ان کو ملکہ، منطق وفلسفہ میں درک، اندازِ گفتگو دلکش، آواز میں غنائیت، لب ولہجہ سنجیدہ، انداز درس ایسا جامع اور منفرد کہ اکابر کی یادیں تازہ ہوں، قہقہہ کا تصور تو کیا مسکرانے کا معاملہ بھی ندارد، ہاں! مسکرائیں تو چمن میں بہار آجائے، مردہ کلیوں میں جان پڑ جائے، غنچے چٹکنے لگیں، طلباء کے درمیان مشہور ہے کہ حضرت دامت برکاتہم مسکرائیں تو یقیناً ایک اچھوتا منظر، وقار اور تدبر کی حسین تصویر، نگاہیں ہمہ وقت نیچی، گردن اٹھا کر نہ چلنے کے عادی اور نہ بات کرنے کے، بذلہ سنجی اور ظرافت سے بھی دوری نہیں، بلا کے حاضر جواب، چٹکیوں میں یوں اڑادیں، طلباء تو طلباء بڑے بڑے دیکھتے رہ جائیں، ظرافت کا غلبہ، لحاظ ومروّت کے خوگر، روایتوں کو زندگی بخشنے والے، اکابر کی تدریسی زندگی کا نمونہ۔'' (ماخوذ از مضمون علم کمال کا مظہر روایات اکابر کا عنوان'')

جی چاہتا ہے کہ میں یہاں ان کے ایک اور مضمون کی چند سطریں پیش کروں جن میں مضمون نگار نے اپنے ایک محبوب ومحترم شاعر کی شاعری اور شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے زمانے کی ناقدری کا کرب آمیز انداز میں شکوہ کیا ہے، اس عبارت کا ہر لفظ ایک صدائے احتجاج بن کر سماعت سے ٹکراتا ہے، آپ بھی اس خوبصورت عبارت سے لطف اندوز ہوں۔

(ساحل فریدی کو) انسانی درد وغم کے اظہار کی قدرت حاصل تھی، زندگی کے نشیب وفراز بنتے بگڑتے رشتوں اور بکھرتی روایتوں کا کرب ان کے اشعار میں بھرپور طریقہ پر موجود ہے وہ شاعری جو روح اور جسم کے

رشتوں کو ایک ڈور میں باندھے رکھتی ہے، ساحل کی شاعری وہی شاعری تھی اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبری کو وہ ایک ناقابل معافی جرم خیال کرتے تھے، موجودہ وقت میں زندہ رہنے کا جو فن ہے اس کے قریب سے بھی ساحل صاحب کا گذر نہیں ہوا تھا، اپنی محنت، اپنی جدوجہد اور اپنی کوششوں سے انہوں نے یہ مقام بنایا تھا، اگر وہی حربہ اختیار کرتے جو ان کے معاصر شعراء نے اختیار کیا تو ان کی کامیابیوں کا سفر کئی دہائیوں پہلے شروع ہو چکا ہوتا۔ یہاں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کے عروج کی کئی دہائیاں گذر چکی ہوتیں، مگر ساحل نے ساحل کی تلاش میں گھٹنوں کے بل بیٹھنا نہیں سیکھا تھا، ان کے فکر و فن کی ہر موج ساحل سے ٹکراتی اور وسیع سمندر کا حصہ بن جاتی۔''

(مضمون ''ساحل فریدی'' سے ماخوذ)

بزرگان دین اور اہل علم پر کچھ لکھنا کس قدر محنت و مشقت کا کام ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس وادیٔ پرخار سے آبلہ پا گذر رہے ہیں، اس کے لیے مطالعے کی وسعت کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی قوت اور تنقیدی بصیرت بھی بے حد ضروری ہے، کسی بھی شخص کی زندگی محض اس کے حیات ناپائیدار کے چند ماہ و سال میں محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسا سمندر ہوتا ہے جسے پوری طرح عبور کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اس کی تہہ میں مخفی جواہرات کو تلاش کر کے باہر نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، مولانا نے ایسے ہی سمندروں میں غواصی کر کے اپنی پسند کے خوبصورت موتی چنے ہیں اور انہیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیئے ہیں، تاکہ وہ خود اپنی پسند سے اپنے لیے کچھ موتی منتخب کر سکیں۔

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نہ صرف یہ کہ اُردو کے ممتاز ادیب ہیں بلکہ وہ اُردو کے بڑے خطیب بھی ہیں اور درس نظامی کے ایک اچھے مدرس بھی، یہ جامعیت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اسٹیج پر جب وہ محو تکلم ہوتے ہیں تو خیالات کی آمد اور جملوں کی روانی

قابل دید ہوتی ہے، ایک اچھے مقرر کی طرح سننے والوں کو وہ اپنے سحر خطابت کے زیر اثر کر لیتے ہیں، مؤثر اور دل نشیں انداز، خوبصورت اور ہیروں کی طرح تراشیدہ الفاظ مربوط اور موزوں جملے اور پاکیزہ خیالات یہ ان کے خطاب کے وہ عناصر ترکیبی ہیں جن کی بناء پر وہ جلسوں کی دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں، دارالعلوم وقف میں ایک لائق مدرس کی حیثیت سے وہ اس ادارہ کے قیام کے بعد روز اول سے مصروف ہیں، پھر سماجی اور معاشرتی روابط بھی کچھ کم نہیں، دوستوں کا حلقہ وسیع، ہر شخص سے اس کے مرتبے کے مطابق ملنے کی کوشش، جس طرح نکھرے نکھرے مضامین لکھتے ہیں، اسی طرح شائستہ گفتگو، چہرہ پر ملاحت آمیز نرمی اور شگفتگی، محفلوں کی جان سمجھے جانے والے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے ہر جگہ اپنا مقام بنا لیا ہے، لکھنے میں، بولنے میں، پڑھنے پڑھانے میں، ملنے ملانے میں، انفرادیت کی شان، جداگانہ انداز۔

افسوس یہ ہے کہ ہمارے حلقوں میں کسی شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام نہیں لیا جاتا اور نہ اس کو وہ سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں جو اس کو کسی وقیع علمی کام کے لیے فارغ کر سکیں، یہ ہر دور کا المیہ ہے اور بڑی اچھی صلاحیتوں کے لوگ اس المیہ کا شکار ہو کر گوشۂ گمنامی میں جا سوئے ہیں، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو ان کی خاندانی نسبت، ذاتی صلاحیت اور مسلسل محنت زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ اس قدر ناشناسی کے دور میں کس کو اتنا موقع ملتا ہے کہ رشحات قلم پر مشتمل اس کے کئی مجموعے منصۂ شہود پر آ جائیں، یہ ان کی ترتیب دی ہوئی یا ان کے قلم سے نکلی ہوئی ۵ ویں کتاب ہے، اُمید ہے ان کے مضامین کے دوسرے مجموعے بھی چھپیں گے، بلکہ وہ کچھ ایسے موضوعات پر گہر افشانی کریں گے جن کی آج امت مسلمہ کو سخت ضرورت ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اس مجموعۂ مضامین کی حقیقی قدر و قیمت کے مطابق کوئی تبصرہ نہیں کر سکا، دراصل مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اپنی تمام تر بصیرت کے باوجود یہاں

غلطی کر گئے اور مجھ جیسے بے بضاعت اور ہیچ مداں کو مقدمہ نگاری کا مکلّف کر بیٹھے، میں نے بے حد کوشش کی کہ اس مقدمہ بازی سے نجات حاصل کرلوں، کیوں کہ میں اس کوچے کی راہ ورسم سے بالکل نا آشنا اور وہ ہر طرح پختہ کار اور تجربہ کار۔ میں نے اپنے حق میں کچھ دلائل بھی دیئے، کچھ شواہد بھی پیش کیے، لیکن استغاثہ کا وکیل اس قدر مضبوط تھا کہ میری ایک نہ چلی۔ مجبور ہوکر ٹال مٹول سے بھی کام لیا، کچھ حقیقی اور کچھ مصنوعی مصروفیتوں کے حوالے بھی دیئے، وعدوں پر وعدے کرتے کرتے چار ماہ بھی گذار دیئے یہ سوچ کر کہ شاید خود اُکتا جائیں اور اپنی راہ لیں، لیکن پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا کہ مولانا موصوف کو اللہ نے جہاں حلم، شرافت، خوش خلقی، شیریں بیانی جیسے اوصاف سے نوازا ہے وہاں انہیں ایک اور وصف سے بھی متصف کیا ہے اور وہ ہے عزم وارادے کی پختگی، انہوں نے سوچ لیا تھا کہ مجھ بے قصور کو اس مقدمہ میں ضرور پھنسائیں گے، وہی ہوا جو انہوں نے چاہا، وہ خود تو اپنی اس کامیابی پر زیر لب مسکراتے نظر آئے، مگر میں مقدمہ کے نام پر چند ٹوٹی پھوٹی سطریں لکھ کر اپنی رسوائی کا تماشہ دیکھنے کے خیال سے لرزہ براندام ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ

ندیم الواجدی

مدیر ماہنامہ ''ترجمان دیوبند''

۳۰ / جنوری ۲۰۰۵ء

فرشتوں کی انجمن کا ایک انسان

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رح

کارواں سے کیسے کیسے لوگ رخصت ہو گئے
کچھ فرشتے چل رہے تھے جیسے انسانوں کے ساتھ

انسان زندگی میں بہت کچھ کھوتا اور بہت کچھ حاصل کرتا ہے، اس پانے اور کھونے کے عمل کا نام ہی زندگی ہے اور جب ہم زندگی کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہر صفحہ پر بامراد ہونے یا محروم رہ جانے کی داستان رقم ہوتی ہے، عمر کا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور پڑاؤ در پڑاؤ بالآخر زندگی کا سفر پورا ہو جاتا ہے اس زندگی میں کچھ اشخاص اور افراد ایسے ضرور ملتے اور ٹکراتے ہیں جن کا ساتھ چاہے مختصر ہو یا طویل جن کی صحبتیں گنتی کی ہوں یا بے شمار ان کی یادیں زندگی کا حاصل اور سرمایہ بن جاتی ہیں اور پھر یہاں سے شروع ہوتا ہے، مایوسیوں اور محرومیوں کا ایک اور سفر، آغاز ہوتا ہے ایک اور کہانی کا، شروعات ہوتی ہے مسرت انگیز اور مسرت خیز لمحات کی، اس سفر، اس کہانی اور داستان کو دہرانے کے لئے ہمت کا ہاتھ تھامنا پڑتا ہے، اور جب ہمت اور طاقت مجتمع ہو جاتی ہے، تب یہ ادھوری، بے ربط اور بے لطف سی سطور قلم کی نوک سے کاغذ کے سینے پر پھیل کر اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں صرف ایک ذریعہ ہے جو اس احساس کی شدت کو کم کر سکتا ہے کہ پرانے دنوں کو یاد کیا جائے اور یادوں

کے دریچے سے جھانک کر ان مناظر کو آنکھوں میں قید کرلیا جائے جو روحِ جاں اور روحِ قلب ہیں۔

اس لایعنی، بے مزہ تمہید کے بعد اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، موضوع ہے وقت کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت کا ذکر، ایک بلند مرتبہ انسان کے احوال، ایک فرشتہ صفت شخص کی یادیں، ایک واعظ، ایک خطیب، ایک مقرر، ایک مفکر، ایک مدرس، ایک مصنف، ایک ادیب، ایک منتظم، ایک متفق علیہ آدمی کا بیان، ایک ایسی ہستی کی باتیں جو روح کی غذا اور قلب کی تقویت کا باعث ہیں، جماعتِ دیوبند کے اس فرزند کا تذکرہ جو الامام الاکبر، حجۃ الاسلام، بانیٔ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم کا شارح، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی اصلاح وتربیت کا نمونہ، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علم وفضل کی یادگار، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کا طلاقت لسانی اور زور خطابت کی مثال، اکابر دارالعلوم کے کمال، تقویٰ، زہد اور ورع کی نشانی دورِ حاضر کا ایک ایسا نورانی پیکر جس کو علم وعمل کی دنیا میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نوراللہ مرقدہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یوں تو یہ جملہ بہت اشخاص کے لئے لکھا جاتا ہے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، اور ان کے وجود کی خوشبو سے علم وعمل کی راہیں پر رونق اور آباد تھیں، مگر حکیم الاسلام حقیقی معنیٰ میں ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت رکھتے تھے، وہ ظاہری اخلاق وعمل کے اعتبار سے بھی بے نظیر تھے اور باطنی کمالات کی وجہ سے بھی ان کو امتیاز حاصل تھا، راقم الحروف کا تأثر یہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ اپنے صاحب علم وفضل معاصرین کی مجالس میں میر مجلس اور شمعِ مجلس تھے ان کے معاصرین کی بڑی تعداد بلا شبہ ان جلیل القدر اور رفیع المرتبت انسانوں پر مشتمل ہے، جو گذشتہ نصف صدی میں چراغِ راہ، چراغِ دین اور چراغِ انسانیت کی صورت روشن رہے ان کی روشنی سے تاریک راہوں کو ہی اجالا نہیں ملا بلکہ تاریک قلوب اور مردہ دلوں کو بھی حرکت اور

روشنی حاصل ہوئی، دینی درس گاہوں، خانقاہی سلسلوں، روحانی رشتوں اور بیعت وارشاد کی مسندوں کو ان افراد نے تابندگی اور توانائی عطا کی حکیم الاسلامؒ کا شمار ان افراد میں کیا جانا چاہئے، جو اعلیٰ، بلند اور باوقار معاصرین کی صف میں ممتاز بن کر رہتے ہیں اور سب کے دلوں میں جن کے لئے احترام ہوتا ہے، اس امتیاز کے باوجود معاصرانہ چشمک کا ان کو شکار ہونا پڑا، ان کی سوانح کا یہ ایک ایسا باب ہے جسے اگر نظر انداز کرتے ہیں تو حکیم الاسلامؒ کی مبارک زندگی کا ایک اہم گوشہ ادھورا اور نامکمل رہ جاتا ہے اور اگر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو بہت سے صاحب جبہ ودستار افراد کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں ویسے بھی میں عوامی سطح پر بولنے یا لکھنے میں احتیاط کا قائل ہوں اور ان مسائل سے خاص طور پر اجتناب برتتا ہوں جو باہمی انتشار وافتراق کا عنوان ہیں مگر کبھی بات ایسے موڑ پر آجاتی ہے جہاں اشاروں میں ہی سہی کچھ نہ کچھ کہنا ضرور پڑتا ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس طرح کا رویہ حق وانصاف کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتا مگر بعض اوقات اجتماعی مفادات بغیر کچھ کہے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ جانے کا اشارہ کرتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنی اعلیٰ علمی نسبتوں اور رابطوں کی وجہ سے صرف جماعتِ دیوبند کا قابل فخر سرمایہ نہیں تھے بلکہ وہ اپنی متوازن طبیعت اور دینی وفکری بصیرت کی وجہ سے تمام حلقوں میں مقبول ومتعارف تھے ان کو خداوند قدوس نے جو اعلیٰ علمی، فکری اور انتظامی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں کسی دوسری جگہ پر ان کا وجود خال خال ہی ہے بزرگوں کی امانت دارالعلوم دیوبند کو جس شان وقار اور عظمت کے ساتھ انہوں نے چلایا اور مقبولیت وشہرت کی جن بلندیوں پر پہنچایا اس میں ان کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے تدبر، تحمل اور تواضع کو بھی بڑا دخل ہے، دارالعلوم کو اپنی معنوی اولاد کی طرح لے کر چلے تو اساتذہ وکارکنان کے عملے کو انہوں نے اپنے خاندان کا فرد سمجھا نہ کوئی ان سے دور تھا اور نہ کسی کو ان کی ذات

سے کوئی خوف، دیکھنے کو تو وہ ایک کمزور اور منحنی سے انسان تھے مگر عزم وحوصلہ اور ارادے وہمت کی ایک ایسی چٹان تھے جس سے سمندر کی بپھری اور بے قابو موجیں بار بار ٹکراتیں اور مایوس ہوکر لوٹ جاتیں کبھی طوفان آیا تو یہ چٹان ایک پہاڑ بن کر اس کی راہ میں حائل ہو جاتی مفادات دارالعلوم کا تحفظ ان کی زندگی کا مشن تھا، دارالعلوم کی علمی ترقیات ان کا اوڑھنا، بچھونا اپنے خاندان اور اہل خاندان کے مسائل اور ضرورتوں کا بوجھ شاید ہی کبھی انہوں نے محسوس کیا ہو، مگر دارالعلوم کی ایک ایک اینٹ سے انہیں دلی لگاؤ تھا اور اس کی ہر ضرورت کی تکمیل ان کی اولین خواہش، دارالعلوم ان کا گھر تھا، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور تھا، ان کے علم وفکر کی جولان گاہ تھا، ان کی کوششوں اور جہد وسعی کا میدان تھا، نہ ان کے بغیر دارالعلوم کی تاریخ مکمل ہوسکتی ہے اور نہ دارالعلوم کو چھوڑ کر ان کو شخصیت کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔

دارالعلوم نے جو با کمال افراد اور اشخاص پیدا کئے ہیں ان کی خدمات، ان کی قابل قدر کوششوں، ان کے نمایاں کارناموں کا سفر کافی طویل ہے اور اس سفر میں بے شمار لوگ اس کے ساتھ چل رہے ہیں، چھوٹے بھی بڑے بھی صاحب علم بھی اور صاحب نسبت بھی، صاحب لسان بھی اور صاحب قلب بھی، تمام خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ حضرتؒ کی ذات تھی، قلم ان کا ایسا جس موضوع کو اختیار کرے اس کے اطراف وجوانب اور گرد وپیش کا مکمل احاطہ کرتا، تحریر بڑی شستہ، جاذب نظر اور پر کشش تھی، استدلال اور اعتدال کے ساتھ بڑی چابک دستی اور مہارت کے ساتھ آگے بڑھتے، پوری تحریر اپنی معنوی اور صوری خوبصورتی کا احساس دلاتی، بات کہنے اور ادا کرنے کا جو ملکہ ان کو حاصل تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے، اختلافی موضوعات پر بھی سنجیدگی، متانت اور احتیاط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ان کی کافی تصانیف بازار میں موجود ہیں جن افراد نے ان کی تحریروں اور کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ حکیم الاسلامؒ نے اختیار کردہ موضوعات کا ہر طرح حق ادا کیا ہے، علومِ قاسمی اور حکمتِ قاسمی کو

جس طرح انہوں نے سمجھا اور پھر جس سہل، سادہ اور آسان انداز میں اس کو بیان کیا وہ انہیں کا حصہ ہے، مسودات کی صورت میں بھی ان کے کافی علمی اور فکری شہ پارے موجود ہیں، گرانقدر مقالات اور قیمتی مضامین کا بڑا ذخیرہ الگ سے اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے، تصنیف وتالیف کا کام سفر وحضر دونوں حالتوں میں جاری رہتا، سفر ٹرین کا ہویا ہوائی جہاز کا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔

تقریر میں ان کو جو انفرادیت حاصل ہے وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی، وہ شعلہ بیان مقرر اور پر جوش خطیب نہیں تھے مگر ان کے لہجے میں شہد کا سا مٹھاس، ان کے بیان میں پھولوں کی سی خوشبو، ان کی گفتگو میں چاندنی کا حسن، اور دریاؤں کی سی روانی تھی، گھنٹوں بولتے نہ خود تھکتے اور نہ دوسرے اکتاہٹ کا شکار ہوتے، قرآن، حدیث، قصص وحکایات، آثار وواقعات، منطق وفلسفہ، حکمت ودانائی، علمی بصیرت وگہرائی، فقہ، ادب، معانی وکلام سب کچھ ان کی تقریروں کا خاصہ تھا، اتنی لمبی اور طویل تقریروں میں نہ اٹکتے، نہ ٹھہرتے، نہ کھنکھارتے اور نہ اپنے موضوع سے دور ہوتے، ان کی تقریریں کیا تھیں ایک ایسا دلچسپ، دلآویز اور دلکش بیان، ''سنئے اور سر دھنئے'' کے مصداق دلائل کا انبار لگا دیتے، دلائل عقلی بھی ہوتے اور نقلی بھی یکساں رفتار تھی نہ اتار نہ چڑھاؤ، پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل وموضوعات کو سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ سامعین کے گوش گذار کرتے، لگے بندھے اور رٹے رٹائے عنوانات پر تقریر کے محتاج نہیں تھے، ہر عنوان ان کے لئے آسان تھا، ہزاروں کا مجمع ہو یا لاکھوں کا، سامعین کی تعداد کم ہو یا زیادہ ان کی تقریر تقریر ہی ہوتی، حاضرین کی کمی یا زیادتی سے نہ مایوس ہوتے اور نہ ان میں جوش پیدا ہوتا وہ دیوبند کے ترجمان تھے، اور اس ترجمانی کو انہوں نے خوبی کے ساتھ نبھایا، ان کے خطبات اور مواعظ کے کئی طویل اور مختصر مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ حکیم الاسلامؒ، واقعی حکیم الاسلام تھے، مسلمانان عالم کے عالمی مسائل سے لے کر دینی، علمی مذہبی اور تعلیمی تقاضوں وضرورتوں پر ان کی

گہری نظر تھی، سیاسی مسائل سے بھی واقف تھے، مگر ان کی قربت کو شجر ممنوعہ سمجھتے، ہاں کبھی موقع ہوتا تو اس میدان میں بھی رہنمائی فرماتے، سیاست کو کبھی نہ اپنانے کے باوجود اس کی نزاکتوں باریکیوں اور الجھاؤ کو بھی جانتے اور خوب سمجھتے تھے، سراپا اتنا خوبصورت، دلکش اور حسین تھا کہ ہزاروں کے درمیان بھی پہچانے جاتے ظاہری حسن کا پرکشش مجسمہ تھے، سرخ وسفید چہرہ، آنکھوں میں ملکوتی چمک، پیشانی پر سجدوں کی نورانیت، ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، خوبصورت دانت، ہاتھ پاؤں نہایت موزوں، قد متناسب، اکہرا بدن، نہ زیادہ دبلے کہ ناگوار معلوم ہوں نہ زیادہ موٹے کہ بھدے لگیں، جسم پر نہ گوشت کی دبیز تہیں اور نہ ہڈیاں لحم سے محروم، چلتے تو محسوس ہوتا کہ فرشتوں کے ہجوم میں چلے جارہے ہیں، نگاہیں نیچی رکھتے، قدموں کی چاپ اتنی دھیمی کہ چلنے تک کا احساس نہ ہوتا، اس عالم میں کبھی مسجد دارالعلوم اور کبھی صدر گیٹ سے گذرتے ہوئے دفتر اہتمام میں پہنچتے اور گھنٹوں کی مصروفیات سے فارغ ہوکر پھر اسی انداز میں طیب منزل میں داخل ہوتے ان کی آمد ورفت کے درمیان ہر شخص محبت اور عقیدت کی نگاہوں سے انہیں دیکھتا، آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کو نہارتا اور ان کے علم، عمل اور اخلاق کے ہزاروں مناظر دل ودماغ میں بسا لیتا، انتہائی نفاست پسند تھے، لباس سادہ تھا، مگر یہی سادہ لباس جب وہ زیب تن کرتے تو ان پر خوب سجتا، بناوٹ تصنع اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کوسوں دور تھے، جب وہ چلیں تو ایک بڑی جماعت یا مجمع ان کے پیچھے ہو اس سے قطعاً بے نیاز تھے۔

حلم اور برد باری، ملنساری، عجز انکساری، حسن اخلاق اور حسن عمل کی لازوال خصوصیات سے بہرہ ور تھے سنگین سے سنگین صورتِ حال میں برداشت اور تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ناگوار حالات میں بھی خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا، چھوٹوں کے لئے انتہائی خلیق اور بڑوں کے یہاں بے انتہاء مؤدب تھے، نسبتوں کا خصوصی احترام تھا، حقوق کی ادائیگی میں مستعد تھے، دیانت اور امانت

کے ساتھ معاملات کرنے کے عادی تھے، کسی کو نقصان پہنچانے کا جذبہ بالکل نہیں تھا، بلکہ ذاتی مخالفین کے ساتھ بھی رعایت اور صرفِ نظر سے کام لیتے، پاکیزہ اطوار، پاکیزہ عادات، پاکیزہ خصائل اور پاکیزہ فکر انسان تھے، ان کے علمی رشتوں کا ایک سرا اگر حضرت امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے جڑا ہوا تھا تو دوسرے سرے کا تعلق حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے تھا، روحانی تعلق حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے رکھتے تھے، ان کی خانقاہ کے تربیت یافتہ اور ان کی روحانی وعلمی مجلسوں کے فیض یافتہ تھے، بزرگانہ اداؤں اور بزرگانہ طرزِ عمل نے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ عظمت اور بزرگی عطا کی تھی، اختیارات کا بیجا استعمال ان کی سرشت میں نہ تھا، انتظامی معاملات میں کسی ڈھیل اور سستی کے قائل نہ تھے، ملازمین اور اساتذہ کا کنبے کے افراد کی طرح خیال کرتے اور ہر شخص کے ساتھ حسب مراتب پیش آتے، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے، نہ کبھی زیادتی کرنے والوں کو ہدفِ ملامت بنایا نہ ستانے والوں کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

مطالعہ ان کی زندگی تھا، مطالعہ کے بغیر شاید کبھی انہوں نے کھانا کھایا ہو، مطالعہ میں ایسے منہمک ہوتے کہ گرد و پیش کی خبر نہ رہتی، سفر میں بھی کتابیں ان کے ساتھ رہتیں، لکھنے سے فارغ ہوتے تو مطالعہ میں مشغول ہو جاتے مطالعہ کی یہ عادت اتنی پختہ تھی کہ اجلاس صد سالہ کی عظیم الشان مصروفیات اور گہما گہمی کے درمیان بھی یہ سلسلہ نہ ٹوٹا، راقم الحروف نے اپنے پندرہ روزہ اخبار ''اشاعتِ حق'' کا صد سالہ نمبر شائع کیا تو اسے لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت حضرت صد سالہ کی زبردست تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، میں قریب ہوا اور حضرت کو نمبر پیش کیا، حضرت نے چند حوصلہ افزا کلمات فرمائے اور دعائیں دیں اور اسی عالم میں ''اشاعتِ حق'' کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے، منتظر رہا کہ شاید کچھ اور فرمائیں گے مگر ان کے

انہماک کو دیکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا جس وقت میں وہاں سے اٹھا تو میں نے دیکھا کہ اخبار کے ۲ صفحے حضرت پڑھ چکے ہیں، اور ان کے انداز سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ جلدی ہی مطالعہ ختم کر دیں گے۔

درس و تدریس میں ان کا اپنا ایک مقام تھا، بخاری شریف، حجۃ اللہ البالغہ، مشکوٰۃ شریف، ترمذی، کئی کتابیں مختلف اوقات میں ان کے زیر درس رہیں، مسند تدریس پر بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے ایک کامیاب اور اعلیٰ مدرس کی تمام صفات انکے اندر موجود تھیں، کتاب کی اہمیت، مصنف کے حالات موضوع کا احاطہ افہام و تفہیم کا خصوصی ملکہ، لغات کی رعایت، حاشیہ و متن پر غائر نظر، مسائل و مرادات کا کامل استحضار، بیان پر قدرت، طلبہ کی طلب اور درس کے تقاضوں کا بھرپور علم تھا ان کی انتظامی مصروفیات نے تدریس کے لئے زیادہ وقت تو انہیں نہیں دیا مگر جتنا وقت بھی انہوں نے اس کام پر لگایا وہ کارآمد، مفید اور نفع بخش وقت رہا، طلبہ نے ان سے خوب استفادہ کیا، حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے اپنے ایک شعر میں حضرت کے درس بخاری شریف کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

باب اول از بخاری درس داد آں خوش نظام

ذات و صفش ہست طیب، نائب خیر الانام

ان کی مجالس کا رنگ خالص علمی تھا اور یہ باوقار علمی مجلسیں عموماً بعد عصر ہوا کرتیں یہ مجالس علماء طلباء اور علم و فضل کے قدردانوں کے لئے ایک نعمت تھیں، کبھی حضرت خود علمی مسائل پر گفتگو فرماتے اور کبھی حاضرین کے سوالات اور اشکالات کے جوابات عنایت فرماتے، یہ مجلسیں ایک شیخ کامل ایک مرشدِ وقت اور ایک صاحب نسبت بزرگ کی مجلسیں تھیں جہاں شریعت کی عظمتوں، تصوف و سلوک کے اسرار و رموز اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کا غلبہ ہوتا، برسہابرس یہ سلسلہ جاری رہا، اور تشنگانِ علم اس چشمۂ صافی سے پیاس بجھاتے رہے، ان کی ان انمول مجلسوں کا ایک مجموعہ بھی

بنام ''مجالس حکیم الاسلام'' منظر عام پر آچکا ہے، گو یہ مجموعہ ان تمام مجالس کا احاطہ نہیں کرتا، مگر کسی نہ کسی حد تک ان مجالس کی اہمیت وافادیت کو ضرور اجاگر کرتا ہے۔

شعروادب سے بھی حضرتؒ کا گہرا تعلق تھا، خاص طور پر نعت اور حمد آپ کی محبوب صنف سخن تھیں، دیگر اصنافِ سخن پر بھی آپ نے طبع آزمائی کی ان کے تمام تر شعری سرمایہ کی بنیاد اصلاح وتربیت پر ہے اکابر کی طرح حمد ونعت کو ہی انہوں نے اپنی فکری پرواز کا محور بنایا، مرشدِ کامل حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے لیکر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تک اور اور اس کے بعد اکثر بزرگوں نے حمد ونعت کا سلسلہ جاری رکھا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی شاعری تو اپنا خاص رنگ اور کیفیت رکھتی ہے اور ان کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو شعر وفکر کی دنیا سے تعلق رکھنے والے نامور افراد کے اشعار کے مقابلے میں بآسانی رکھے جاسکتے ہیں، حکیم الاسلامؒ کی شعریؒ اور فکری صلاحیتوں کا ذکر وقت کی معروف صاحب قلم اور صاحب کمال شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی نے جس وقیع انداز میں کیا ہے اس سے حکیم الاسلامؒ کی پختہ گوئی، برجستگی، سلاست اور روانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی نورانی، پاکیزہ اور قابل تقلید زندگی کے بہت سے دیگر خوشنما اور حسین عنوانات ہیں جن کو ایک سوانحی مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے حکیم الاسلامؒ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۲۰ر سال ہورہے ہیں، ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو یہ صاحب علم وفضل انسان، جماعت شیخ الہند کا نورِ نظر، اکابر واسلاف کی نشانی، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی کا ایک نمونۂ کامل، تقریر وخطابت کا نامور شہسوار، تحریر وقلم کی باعظمت ہستی عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کرگئی، ۲۰ر سال کا عرصہ معمولی نہیں ہوتا، ان ۲۰ر سالوں میں راقم الحروف نے بلا مبالغہ دس مضمون تو حضرتؒ پر لکھے ہیں اور ہر بار بہت لوگوں سے یہ سنا کہ ایک ہی شخصیت پر تم اتنا کیوں

لکھتے ہو، میں آج تک ان حضرات کو اس سوال کا جواب تو نہیں دے سکا مگر میرے ذہن کے کسی گوشے سے یہ آواز ضروری آتی ہے کہ جن افراد واشخاص کو میں نے دیکھا ہے اور ایک بلند مرتبہ انسان کا جو تصور میرا ہے اس تصور میں کسی اور شخص کو میں شریک نہیں کر سکا جو معیار شخصیت کو پرکھنے کا میرا ہے اس معیار پر کسی اور انسان کو میں نے نہیں پایا اس کو میری خوش گمانی یا عقیدت جو کچھ آپ کہیں کہہ سکتے ہیں، اس میں آپ بااختیار ہیں۔

اس موقعہ پر اس افسوس کے اظہار پر بھی میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ اس طویل عرصہ میں حضرتؒ کی کوئی مکمل اور وقیع سوانح منظر عام نہیں آسکی، قاسمی برادری کے ہزاروں قابل، باصلاحیت اور صاحبِ قلم افراد ہندوستان اور ہندوستان سے باہر موجود ہیں، مگر کوئی بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکا، ایسا لگتا ہے کہ ذہنوں پر ابھی تک دھول جمی ہوئی ہے اور فضاء ابھی بھی غبار آلود ہے، اس محرومی کا احساس اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں گذرنے والے اکابر علماء اور نامور افراد پر کافی چیزیں سامنے آچکی ہیں،، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کی سوانح حیات، حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ پر کئی رسائل کے معیاری نمبر، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سوانح اور نمبرات کی ایک طویل قطار، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ کا مفصل تذکرہ اور تو اور حضرت مولانا منظور نعمانیؒ صاحب پر بھی الفرقان کا اچھا خاصا نمبر آچکا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام کی سوانح لکھنے کا کام بہت سے افراد انجام دے سکتے ہیں، لیکن اس کام کے لئے اگر کسی موزوں شخص کا انتخاب کرنا ہو تو نگاہیں خود بخود ان حضرات کی طرف اٹھ جاتی ہیں، حیدرآباد میں محترم حضرت مولانا محمد رضوان صاحب قاسمی[1]، دہلی میں قاسمی برادری کے بیشتر افراد، دیوبند میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت

[1] افسوس گذشتہ دنوں حضرت مولانا مرحوم بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوگئے۔

برکاتہم، حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی، حضرت مولانا سید عبداللطیف صاحبؒ ناظم مظاہر العلوم سہارنپور کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب عالی، اور کویت میں مقیم حضرت مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی بڑی خوبی کے ساتھ یہ کام کر سکتے ہیں، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے لئے تبلیغی اسفار اور انتظامی مصروفیات کی بنا پر یہ کام کٹھن ہے ان کی بہ نسبت حضرت مولانا محمد اسلم صاب قاسمی کے لئے راستہ سہل ہے، مولانا سید عبدالرؤف صاحب عالی دفتر کی فائلوں اور کاغذات کے ڈھیر میں دبے ہوئے ہیں جہاں ان کی اعلیٰ فکری اور قلمی صلاحیتیں اگر سوئی نہیں تو غنودگی کا شکار تو ہو ہی گئی ہیں، حضرت مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی مادّی سہولتوں اور آسائشوں کے حصول میں علمی دنیا سے دور ہو گئے ہیں اور دیو بند سے تو انہوں نے اپنا علمی رشتہ تقریباً منقطع ہی کر لیا ہے اس عالم میں خدا کرے کوئی صاحب ہمت قاسمی اٹھے اور اس معرکہ کو سر کرے[1]

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ چند ماہ پہلے ہی حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے یہ کارنامہ انجام دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

متاعِ آخرِ شب

مفکرِ اسلام حضرت مولانا

سید ابوالحسن علی ندویؒ

اس دنیا میں آنے والے جانے کے لیے ہی آئے ہیں، نہ کوئی جانے والوں کو روک سکا اور نہ کوئی ان کا ہاتھ تھام کر چند لمحوں کے لیے ہی سہی سفر موقوف کرنے پر آمادہ کر سکا، پیغمبروں نے کوچ کیا، ولیوں نے رخصت اختیار کی، علماء نے رختِ سفر باندھا ہر ذی روح اپنے اصل ٹھکانے کی طرف لوٹ رہا ہے بس باری کا انتظار ہے جس کا نام پکارا گیا اُس نے لبیک کہا یا جس کے کاغذات پر مہر لگ گئی وہ عازمِ سفر ہوا۔

یوں تو ہر آدمی کی جدائی اس کے متعلقین اور اعزہ و اقارب کے لیے سوہانِ روح ہے، مگر بعض نسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بہت سی علمی مجلسیں سونی ہو جاتی ہیں علم و فکر کے بہت سے دروازے بند ہو جاتے ہیں ادب و انشاء، وعظ و تقریر اور بیعت وارشاد کے ایوانوں میں طویل مدت کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات سے یہی سب کچھ ہوا اور اِن سب جگہوں پر اُن کی کمی اور غیر موجودگی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا، وہ ایک ایسی دلنواز اور دلکش شخصیت کے مالک تھے کہ جن کی قربت کا ہر شخص متمنی ہوتا ہے وہ ایسی علمی حیثیت کے حامل تھے کہ طالبانِ علم و عمل کی منزل قرار پائے وہ تحریر تقریر کی اُن بلندیوں پر تھے جن کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے، مگر جہاں تک پہنچا نہیں جا سکتا اُن کی علمی عظمتوں کے ہزاروں نمونے اُن کی

شاہکار کتابوں، اعلیٰ تاریخی اور تحقیقی مقالات میں موجود ہیں، وہ اس دَور کے اُن چند انسانوں میں سے تھے جن کو اللہ نے خصوصی مقاصد کی تکمیل کے لیے اِس دنیا میں بھیجا تھا، ہمارے قریب کے دور کی دو بڑی شخصیتیں ایسی ہیں کہ اُن کے کاموں اورخدمات کا اگر جائزہ لیا جائے اور اُن کی ہزار رنگ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں بھی شاید پورا حق ادا نہ کرسکیں اُن میں ایک حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب نوراللہ مرقدہ ہیں اور دوسرے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، اِن دونوں جلیل القدر انسانوں نے علم وعمل اور ذہن وفکر کی آبیاری کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا اُس کا سیدھا سلسلہ ہمارے اسلاف واکابر سے جا کر ملتا ہے اور جن کے کاموں اور خدمات سے پچھلوں کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔

اگر جائزہ لیا جائے تو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی پر اکابر دیوبند کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں، زمانۂ طالب علمی سے ہی انہوں نے جماعت دیوبند کے برگزیدہ لوگوں اور اصحاب علم سے تعلق قائم کرلیا تھا، مختلف اوقات میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر مستقل طور پر مراسلت کے ذریعہ استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا، ان کی ذہنی تربیت اور فکری نشو ونما میں علمائے دیوبند کا بڑا ہاتھ ہے، چار ماہ انہوں نے دیوبند میں قیام بھی کیا، قیام کا اکثر حصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے مکان پر گذرا، اور باقی وقت دیوبند ہی میں دوسری جگہ رہائش اختیار کی، اس زمانہ میں حضرت شیخ الاسلام سے تعلق کے علاوہ انہوں نے امام المنطق والفلسفہ حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے معقولات کی مشہور کتابیں پڑھیں، انہوں نے یہاں کے علمی ماحول کے براہ راست اثرات قبول کئے اور زندگی کی مختلف منزلوں میں وہ علماء دیوبند سے وابستہ رہے، حقیقی معنیٰ میں یہ وابستگی بڑی مستحکم اور نتیجہ خیز رہی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مرشد روحانیت حضرت مولانا شاہ وصی

اللہ فتح پوریؒ، مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، مرشد کامل حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ وغیرہ جیسے جبال علم وفضل اور نابغۂ عصر افراد سے انہوں نے خوب خوب استفادہ کیا، اور آخرالذکر دونوں افراد سے رشد وہدایت کی دولت پائی، ویسے علی میاں علیہ الرحمہ کے اپنے دور کی تمام ہی سرکردہ شخصیات سے تعلقات تھے، مگر علمائے دیو بند سے ان کے تعلقات کی نوعیت بالکل مختلف تھی اور ان کی زندگی، ان کے فکر وعمل اور اخلاق وکردار پر اکابر دیو بند کے علوم وکمالات اور فقر وزہد کا بھرپور عکس تھا، اور زندگی کے آخری سانسوں تک وہ عکس دھندلا اور مدھم نہیں ہوا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید بوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر محیط تھی اور اُن کی شخصیت کا ہر پہلو قابل رشک اور قابل دید ہے، اور پھر ہر جگہ وہ ایک اعلیٰ انسان کی صورت میں بلندیوں پر کھڑے نظر آتے ہیں ہر سمت میں اُن کی قدموں کی چاپ محسوس کی جاسکتی ہے اور ہر جہت میں اُن کی فکری صلاحیتوں کی روشنی دکھائی دیتی ہے علماء کا ایک طبقہ تو وہ ہے جنہوں نے اپنے کاموں اور جہد وعمل کے لیے کسی خاص میدان کو منتخب کیا جیسے حضرت شیخ الہندؒ کہ آزادی کے حصول کو نہوں نے مقصدِ زندگی بنالیا تھا گو اُن کی علمی رفعتوں اور عظمتوں کا دریا پوری روانی اور توانائی کے ساتھ بہتا رہا، اور علمی دنیا برابر اور مسلسل اُن سے مستفید ہوتی رہی دوسری شخصیت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ کی ہے جنہوں نے بنیادی طور پر اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ امت کا وقیع کارنامہ انجام دیا اور بدعات ورسومات کی بیخ کنی میں اپنی پوری قوتیں صرف کردیں حالاں کہ ہر محاذ پر وہ دکھائی دیتے ہیں اور ہر جگہ ان کے نقوش قدم گہرے اور روشن ہیں حضرت تھانویؒ کے وقیع، جلیل اور ارفع کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ چند لفظوں اور چند جملوں میں ان کو سمیٹنا ناممکن ہے کچھ اسی طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی میں ایسے رنگ بکھرے ہوئے ہیں کہ ہر رنگ میں دعوت وعمل اور فکر وتدبر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں دنیا نے اُن کو اُس

وقت بھی خراجِ تحسین پیش کیا جب وہ حیات تھے، اوران کے گذرنے کے بعد بھی ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی کمی نہیں ہے کسی نے ان کو مستند عالم گردانا، کسی نے ان کو عربی کا زبردست ماہر شمار کیا، کوئی ان کو اردو کا نامور ادیب لکھنے پر مجبور ہوا اور کسی نے ان کو ایک مفکر اور دانشور کی صورت میں دیکھا، تمام تاثرات اپنی جگہ درست اور ہر بیان واقعہ کے مطابق مگر میرے نزدیک جو صفت ان کی زبردست مقبولیت اور محبوبیت کا سبب بنی وہ ان کی بے نفسی، بے ریائی اور مال ودل سے بے اعتنائی تھی۔

ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو پالیں فنائیت اور استغناء کی دولت سے مالا مال ہوں اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا وجود قابل رشک تھا اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ بھی تھے، ان کو بھی خداوند عالم نے اسی خصوصیت نے نوازا تھا سید ابوالحسن علی ندویؒ اگر دولت کے متلاشی ہوتے تو کروڑوں روپیہ ان کے بینک بیلنس کی صورت میں ہوتا اور زمین وجائداد کی تفصیلات کو تو تھامنا ہی مشکل ہو جاتا اور انعامات اور ایوارڈ کی شکل میں ان کو کروڑوں روپیہ ملا یہ روپیہ جتنی دیر ان کے ہاتھوں میں رہا اس سے کم وقت میں وہ مختلف اداروں، مدارس اور تنظیموں کے کھاتوں میں جمع ہو گیا انہوں نے مصر، شام، سوڈان، ترکی، اُردن، سعودی عرب، کویت، برما، لندن، پیرس، امریکہ، اسپین، افغانستان، عمان، پاکستان، بنگلہ دیش، عراق، فلسطین، ملیشیاء، اور مراکش وغیرہ کے اسفار کیے ہر ملک میں ان کے عقیدت مند اور قدر دان تھے مگر کہیں بھی ان کے متعلق یہ تأثر قائم نہیں ہوا کہ ان کے یہاں اپنی ذات مقدم ہے، بلکہ مفادِ ملت ان کو زیادہ عزیز تھا ملت کے بکھراؤ اور انتشار سے وہ ہمہ وقت افسردہ رہتے یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تحریروں میں اتحادِ ملت کی عام دعوت ہے وہ ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان دیکھنا چاہتے تھے اور اپنے کردار وعملکے احتساب وجائزے کو انہوں نے اولیت بخشی ہوئی تھی، اس سلسلہ میں وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بات کرنے کے

عادی تھے، کلکتہ کے عام اجلاس میں جو ۵/لاکھ افراد پر مشتمل تھا انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا تھا کہ:

"جب ہم حکومت اور برادرانِ وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کا حق کیوں نہ ہو؟ اُن سے شکایت کریں گے، اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا نہیں ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا، جو آپ کا گریبان پکڑے گا، کہ پہلے تم اپنے گریباں میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اِس قانون پر کتنا چلتے ہو تم اپنے گھروں میں اِس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے۔" (تعمیرات حیات لکھنؤ، مفکرِ اسلام نمبر)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے بعد وہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک ایسے صدر تھے جنہوں نے اپنے پیش رَو کی طرح مسلک ومشرب کے ہر انسان کو ایک ڈور سے باندھے رکھا اور اُس اسٹیج پر ہر طبقہ اور مکتب فکر کے علماء اور دانشور اسی طرح جمے رہے، آج کی بیمار صدارت (صاحب صدر کی بیماری مراد ہے) کی طرح نہیں کہ جو اول مرحلہ میں ہی تنازعہ کا شکار ہوگئی اِس تنازعہ کے کچھ پہلو بھی سامنے آئے خیر ہوئی کہ یہ پہلو عوامی سطح پر نہ اُبھرے اور ایک عام آدمی ان پر واقف نہ ہوسکا، علی میاںؒ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے وقار کو پورے طور پر برقرار رکھا اور اُس کی افادیت، اہمیت اور قوت کا اظہار مختلف مواقع پر ہوا خاص طور پر بابری مسجد کی شہادت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے سنگین حالات میں بورڈ کا کام متوازن اور لائقِ تحسین رہا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت ایسے ہی معتدل مزاج اور نرم خو انسان کی متقاضی تھی اور علی میاں اِس منصب کے لیے پوری طرح موزوں تھے، علی میاں کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو زندگی کا ہر لمحہ قوم کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور ملت کی ہر

چھوٹی بڑی پریشانی کے وقت مستعد اور چاق و چوبند رہتے ہیں انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ قیادت و سیادت کے پُر خار راستوں پر گذارا مگر کوئی راستہ ان کے عزائم اور حوصلوں کو شکست نہ دے سکا وہ چلتے رہے بڑھتے رہے اور اپنی منزل پر پہنچ کر ہی انہوں نے سانس لیا اُن کی ایک اور خوبی جو اُن کو ممتاز کرتی ہے وہ مختلف صلاحیتوں کے افراد کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے کام لینے کی ہے انہوں نے اپنے ارد گرد ایسے لوگ اکٹھا کر لیے تھے جن کا تعلق مختلف شعبوں سے تھا اور ہر شعبے میں ان کی ایک خاص پہچان تھی ایسے صلاحیت مند اور صاحبِ فکر افراد کو ایک مخصوص فکر سے جوڑ لینا اور پھر من موافق ان سے کام لینا ایک بڑا کارنامہ ہے وہ متعدد بار دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے دیو بند آئے اور احقر نے کئی باران کی زیارت کی ہر زیارت کے بعد یہ تأثر گہرا ہوتا چلا گیا کہ وہ شریف النفس اور کریم الطبع انسان ہیں ان کی پیشانی پر ایک مردِ مؤمن کی علامتیں اور ان کی آنکھوں میں ایک خدا رسیدہ بزرگ کی چمک دکھائی دیتی تھی ان کی گفتگو میں گہرائی اور آواز میں ملی ہمدردی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں، وہ مہمان خانہ سے دفتر اہتمام تک کا فاصلہ جتنی دیر میں طے کرتے اتنی ہی دیر ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب باوقار صورت میں ہمارے سامنے ہے اور پچھلوں کی ہر ادا، ہر حرکت کو ہم چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔

علی میاںؒ عربی اور اردو کے نامور ادیبوں میں گنے جاتے تھے، اُن کی عربی اور اردو تحریریں جتنی سہل اور آسان ہوتیں اتنی ہی ان میں ادبی چاشنی اور روانی ہوتی اُن کا رنگ اتنا گہرا ہوتا کہ قلب اور ذہن پر اس کے براہ راست اثرات مرتب ہوتے، الفاظ کے انتخاب پر ان کو ایک درجہ میں حکمرانی حاصل تھی اصطلاحات اور محاورات کے استعمال میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے، جذبات کی شدت اور فکر کی بلندی اُن کی تحریر اور تقریر دونوں میں یکساں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے تپش حرارت اور اثر آفرینی کی تمام خصوصیات ان کے مضامین، مقالات اور تصانیف کا حصہ ہیں اِس سلسلہ میں پروفیسر

وصی احمد صدیقی کا یہ بیان اِس حقیقت کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے لاتا ہے کہ:

''حضرت مولانا حرف ومعنی کے اندرونی رشتے سے بخوبی واقف ہیں فکر کی گہرائی اور تخیل کی رعنائی ان الفاظ سے ہم آہنگ ہوگی جو مولانا استعمال کرتے ہیں اضطراب اور خلش کا بیان، مردانِ کار کے کارناموں کا ذکر، اقدارحیات کا تعین سب کے لئے الفاظ سے بنی ہوئی فضا الگ ہوجاتی ہے لیکن آفاقیت اور ہمہ گیری سے کوئی بیان خالی نہیں ہوتا اور یہ کمال بھی کہ چشمِ زدن میں اشیاء کے باطن کو سامنے کردیا اس شوق، عشق، تپش اور جذبے کے ساتھ جو اُن کے بیان کا خاصہ ہے روانی اور بے ساختگی میں کہیں فرق نہیں آتا۔''

(تعمیر حیات لکھنؤ، مفکر اسلام نمبر)

بلا شبہ ان کی تحریروں اور بیان میں ایک خاص قسم کی حلاوت اور ایک مخصوص قسم کی رفعت وشوکت تھی جو قاری اور سامع کو خوبی کے ساتھ اپنے ساتھ چلنے اور سوچنے پر مجبور کرتی تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور حافظہ مضبوط تھا، تاریخ کے بے شمار صفحات ان کو ازبر تھے، جو زیرِ قلم بھی آتے اور زبان پر بھی جاری ہوتے ایک بہترین مبصر اور ناقد تھے مگر تبصرہ اور نقد کی حدود پہچانتے اور جانتے تھے، علم اُنکا مستحکم تھا اور کثیر الجہات بھی، حدیث تفسیر، فقہ، ادب، تاریخ وغیرہ دیگر علوم وفنون کا خاص ملکہ، ذوق اور مزاج تھا عالمی مسائل سے لے کر ملکی مسائل تک پر اُن کی نظر تھی، خاص طور پر ملت اسلامیہ کی زبوں حالی، اخلاقی گراوٹ، تعلیمی بے توجہی اور علومِ قرآن وحدیث سے بے اعتنائی کو وہ خوب سمجھتے تھے، انہوں نے ہر سمت میں کام کیا اور ہر جہت میں اپنی پُر وقار شخصیت کا احساس دلایا ان کے رخصت ہوجانے کے بعد یہ تأثر گہرا ہوتا چلا جارہا ہے کہ ملت اپنے ایک قیمتی سرمائے سے محروم ہوگئی اور ان راہوں پر ہمیشہ کے لئے

محرومیوں نے ڈیرہ ڈال دیا جو صرف ان کے لیے خاص اور ان ہی کے دم سے پر رونق اور آباد تھیں وہ ایک قیمتی متاع کی صورت میں ہمارے درمیان موجود تھے، ایک ایسی متاع جسے ہم متاعِ آخر شب کے نام سے یاد کر سکتے ہیں حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی زید مجدہم مہتمم دارالعلوم (وقف) نے اپنے مضمون ''بے مایہ ملت کی ایک مایۂ گراں مایہ سے محرومی'' میں یہ جو لکھا تو بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

> ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ صرف ایک عظیم شخصیت نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف آخر کی تقریباً تمام تاریخ ساز شخصیات کی خصوصیات کو حق تعالیٰ نے ان کی ذات گرامی میں جمع فرما دیا تھا۔''

(تعمیر حیات لکھنؤ، مفکر اسلام نمبر ۱۲۴)

ایک مسیحا کی داستانِ زندگی

مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

دیو بند ایک چھوٹی سی بستی ہے، مگر خدائی فضل وکرم کے لاتعداد آثار اور بے شمار نشانیاں یہاں آپ کو نظر آئیں گی، علم وعمل کے کوہِ گراں، رُشد وہدایت کے روشن مینار، فکر وفن کی ہزارہا قندیلیں اور اخلاق وشائستگی کے چھوٹے بڑے چراغ آپ کو یہاں روشن ملیں گے، جنگ آزادی کی پُر خار راہیں ہوں یا فضل وکمال اور علم وتحقیق کے پُر پیچ راستے یا پھر ادب وصحافت کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں دیو بند ہر موڑ پر آپ سے ملاقات کرے گا اور ہر سمت میں اس کی خدمات کی تاریخ رقم ہوگی، گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں لفظ ''دیو بند'' اتنی بار لکھا پڑھا اور بولا گیا ہے کہ صرف اس ایک لفظ کو تمام جگہوں سے اٹھا کر...... ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں بھی اس لفظ کی معنویت، وسعت اور پھیلاؤ کو سمیٹنے میں ناکام ہوں۔

ہمارے قریب کے زمانے میں دیو بند کی ایک بلند قامت اور بلند فکر شخصیت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کی رہی ہے، مفتی صاحبؒ لفظوں کی جادوگری کے اعتبار سے نہیں بلکہ حقیقی معنی میں ایک سحر آفریں، دلکش اور پُر اثر شخصیت کے مالک تھے، ان کی ذات کہنے کے لئے نہیں بلکہ واقعہ میں ایک انجمن اور ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو تاریخ کا حصہ نہیں بنتے بلکہ خود اجلی، نکھری اور باوقار تاریخ لکھتے ہیں، مفتی صاحبؒ یک اعلیٰ علمی

خاندان کے فرد تھے ان کے جدِّ امجد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تھے دارالعلوم کے ممتاز عالم و مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ عثمانی ان کے والد اور ان کے چچاؤں میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے اسمِ گرامی شامل ہیں، یہ تمام افراد تاریخ دیوبند اور تاریخ دارالعلوم کے وہ قابلِ فخر قابلِ احترام افراد ہیں، جن کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش خود کو ایک نعمت سے محروم اور مایوس کرنے کی کوشش ہوگی۔

مفتی صاحبؒ نے دیوبند میں آنکھیں کھولیں اور یہیں رہ کر تعلیمی زندگی کے تمام مراحل طے کئے، اپنے وقت کے نابغۂ روزگار افراد سے اکتسابِ علم اور اکتسابِ فیض کیا، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے اور مستقبل میں اس جماعت کے ممتاز فرد بننے والے تھے، جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ کی صورت میں نصف صدی زائد تک آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب کی جماعت بنی رہی، مفتی صاحبؒ نے دو سال کے قریب دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ساتھ ساتھ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے، وقت کے ساتھ انسان کے حالات بھی تبدیل ہوتے ہیں، یہ تو نہیں معلوم کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر مفتی صاحبؒ نے دیوبند سے دہلی تک کا سفر طے کیا اور پھر دہلی ہی کو اپنا دوسرا اور مستقل گھر بنالیا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ دہلی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، یہاں پہنچ کر انہوں نے ندوۃ المصنفین جیسے اشاعتی ادارے کی بنیاد ڈالی، آگے چل کر یہ ادارہ جماعتِ دیوبند کے ان ممتاز اداروں میں سے ایک بنا جو اپنے علمی، تاریخی، تحقیقی کاموں کی بنا پر متعارف اور مشہور ہیں، مفتی صاحبؒ نے تنہا اس سفر کا آغاز کیا، مگر شب و روز کی محنتوں سے ایک ایسی جماعت تیار کر لی جس کا ہر فرد انگوٹھی میں نگینے کی حیثیت رکھتا تھا۔

مفتی صاحب بلند ہمت اور بلند عزائم کے مالک انسان تھے، حوصلہ کے

ساتھ زندگی گزارنا اور نڈر و بے خوف ہو کر کاموں کو انجام دینا ان کی فطرت تھی، ندوۃ المصنفین ان کے بلند حوصلوں کی داستان سناتا ہے، ابھی اس ادارے نے عمر کی دس منزلیں ہی طے کی تھیں کہ دہلی ۴۷ء کے بھیانک فسادات کی لپیٹ میں آگئی، ندوۃ المصنفین بھی اجڑا، مفتی صاحبؒ کا مکان بھی ختم ہوا اور آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں سب کچھ جل کر خاک ہو گیا، دہلی کے مسلمان تباہ اور خانماں برباد ہوئے، مفتی صاحبؒ نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ ان کی حفاظت اور بازآبادکاری کا تاریخی کارنامہ انجام دیا، یہ زمانہ تباہ حال اور برباد مسلمانوں کو محفوظ ٹھکانوں پر پہنچانے، ان کی مدد کرنے، ان کا حوصلہ بڑھانے میں گزرا، نہ دن دن تھا نہ رات رات تھی، ایک جنون تھا مسلمانوں کی ہمدردی اور دردمندی کا، ایک اضطراب اور بے چینی تھی جو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی، یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں ہر لمحہ مفتی صاحبؒ کا اسی جذبے اور تڑپ کی نذر ہوا اور یہ سلسلہ کہیں نہیں تھما، بلکہ ملت کا یہ مسیحا پوری زندگی ملت کی مسیحائی اور فکر میں ڈوبا رہا، میرے نزدیک وہ مفکر ملتؒ سے زیادہ مسیحائے ملت تھے، وہ موجودہ دور کے رہنماؤں کی طرح روایتی اور اصطلاحی انداز کے رہنما نہیں تھے، جو مصلحتوں کی چادر اوڑھ کر یا الفاظ کی کرتب بازیوں سے آگے نکل جاتے ہیں اور پھر پوری زندگی مجبور، بے بس اور لاچار ملت کی ہڈیاں چوسنے اور بوٹیاں نوچنے میں مصروف رہتے ہیں۔

ندوۃ المصنفین دوبارہ قائم ہوا، اس کی نشأۃ ثانیہ کا یہ دور نہایت متحیر کر دینے والا دور ہے، تنکا تنکا جمع کر کے آشیانے کی تعمیر ہوئی اور برصغیر کے مسلمانوں نے نہایت حیرت کے ساتھ ایک بار پھر ندوۃ المصنفین کی تعمیر و ترقی کا چکا چوند نظارہ دیکھا، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، حضرت مولانا حامد الانصاریؒ غازی، حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھیؒ جیسے زعمائے وقت کی تاریخی اور تحقیق

کتابیں اسی ادارے سے شائع ہوئیں، نصف صدی تک اس ادارے نے خوب خوب دادِ تحقیق دی، مفتی صاحبؒ کی خود کوئی تصنیف نہیں ہے، حالات نے ان کو اتنا وقت اور موقع ہی نہیں دیا کہ وہ دل جمعی کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام انجام دیں، گو قلم ان کا پختہ اور رواں دواں، علم ان کا مضبوط اور مستحضر اور جدید وقدیم معلومات پر ان کی نظر تھی، مگر جو میدان انہوں نے اپنے لئے منتخب کیا تھا، اس میں اس طرح کے کاموں کی گنجائش نہیں تھی، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ندوۃ المصنفین کی بہت سی معیاری کتابیں وہ ہیں جن کے موضوعات، خاکے، عنوانات مفتی صاحبؒ نے لکھے اور پھر جس صاحبِ قلم سے چاہا فراہم کردہ معلومات اور بنیادوں پر کتابیں لکھوائیں گئیں، ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ماہنامہ ''برہان'' کا اجراء تھا اپنے انتہائی تحقیقی اور علمی مضامین ومقالات کی بنا پر یہ رسالہ ۵۰/ سال تک اصحاب علم کے مطالعہ میں رہا، نہایت پابندی کے ساتھ اس رسالے کی اشاعت کا اہتمام تھا، ملک و بیرونِ ملک کے نامور اہلِ قلم اس کے خاص مقالہ نگار تھے، مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے مؤقر ممبر، جمعیۃ علمائے ہند کے کارگذار صدر، بے شمار تنظیموں، اداروں اور مدرسوں کے سرپرست تھے، ہر ایک کے مربی، ہر ایک کے لیے شفیق اور مہربان، نہ اپنوں سے شکایت نہ غیروں سے گلہ، اپنی وضع داری کو ہر صورت میں باقی رکھا، لحاظ و مروت ان کا وصفِ خصوصی تھا، وہ دشمن بھی اگر سامنے آتا جس نے دل پر برچھیاں چلائی ہوں مفتی صاحبؒ کے دروازے اس کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے صبح وشام لوگوں کا تانتا بندھا رہتا، ایک جاتا دوسرا آتا، مفتی صاحبؒ پوری سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ آنے والوں کے مسائل اور دشواریوں کو سنتے اور جس طرح کی مدد کا خواہاں ہوتا اس کی مدد فرماتے، بے روزگار نوجوان، یونیورسٹیوں، کالجوں میں داخلے کے خواہش مند طلباء، غربت اور افلاس کا شکار لوگ، سرکاری دفاتر میں سفارشات کے طالب افراد، بیواؤں کی مدد، یتیموں کا تعاون ہر کسی کے لیے دیدہٗ

ودل فرشِ راہ تھے، دہلی میں ان کی بڑی عزت تھی، مرکزی حکومت بھی ان کا احترام کرتی اور ایک عام آدمی بھی ان سے محبت اور عقیدت رکھتا۔

مفتی صاحبؒ کی ''جی ہاں'' بڑی معنیٰ خیز تھی، جب وہ ''جی ہاں'' کرتے تو ادائیگی کے آہنگ سے ہی اس کی معنویت سامنے آتی، کبھی یہ ''جی ہاں'' قلب وجگر کو چھیدتی ہوئی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی، کبھی سلگتے اور تپتے ماحول میں بارش کے چھینٹوں کا کام کرتی، ناخوش گوار مواقع پر اس ''جی ہاں'' کا مفہوم ہی بدل جاتا، ''جی ہاں'' سے کبھی تائید ہوتی اور کبھی تنقید، مخاطب ہی اس کی صحیح سمت متعین کرسکتا تو کر لیتا ہر ایک کے لیے اس کے رخ اور منشاء کا اندازہ لگالینا مشکل تھا، مجلس شوریٰ میں کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ ممبران اپنے قد سے بڑھ کر اچھل کود مچاتے صورتِ حال لفظی جنگ کی حدود پار کرنا ہی چاہتی کہ مفتی صاحبؒ کی ''جی ہاں'' سے معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور پوری مجلس پر خاموشی چھا جاتی، مفتی صاحبؒ کو میں نے بارہا دیکھا، بارہا ان سے ملاقات ہوئی، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس دور کے ایک ایسے انسان کو دیکھا ہے جس پر ہماری تاریخِ ملت کو فخر ہے اور جو اپنے خلوص، محبتوں، چاہتوں، فکر وتدبر، خوداخلاقی وخوش مزاجی، متانت اور بردباری، تحمل اور رواداری، رعایت ومروت لحاظ اور پاس داری، خردنوازی وخودداری میں یکتا اور منفرد تھا، وہ اپنے لباس، حلیہ اور رکھ رکھاؤ کسی زاویے سے بھی بڑے انسان نظر نہیں آتے تھے، حالانکہ ہر صورت میں وہ بڑے تھے اور یہ بڑا نظر نہ آنا ہی ان کی عظمت اور بڑائی کی دلیل ہے، سادگی، خندہ روئی اور اپنائیت کے ہزاروں منظر ہم نے دیکھے اتحادِ ملت کا ان میں بڑا جذبہ تھا، وہ دلوں کو توڑنے کا کام نہیں کرتے تھے، بلکہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے اور زخموں پر مرہم رکھنے کو ہی وہ انسانیت وشرافت کا معیار خیال کرتے تھے، ان کی ذات اپنوں، غیروں، شناسا اور اجنبیوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے وجود میں آئی تھی، دکھ دینا، تکلیف پہنچانا یا سطحی مفادات کی خاطر حلقوں، جماعتوں اور افراد کو زیروزبر کردینا ان

کی سرشت میں نہیں تھا، انہوں نے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، بلکہ خود اس کا شکار ہوئے تھے، اس لیے ملی درد وکرب کوٹ کوٹ کر ان میں بھرا ہوا تھا، بلاشبہ وہ ایک نامور عالم، ایک صاحبِ قلم شخصیت، ایک صاحب فکر انسان اور شرافت و آدمیت کا حسین پیکر تھے، ان کی ذات میں خداوندِ عالم نے خوبیوں اور کمالات کو اس طرح جمع کر دیا تھا، کہ ان کے ذکر کے بغیر ان کی داستانِ زندگی ادھوری اور نامکمل ہے، مفتی صاحبؒ کے گرامی قدر معاصرین اور وہ چھوٹے جنہوں نے ان کو قریب سے دیکھا، آزمایا اور پرکھا، مفتی صاحبؒ کے بارے میں ان کے قیمتی تأثرات کا ایک حصہ پڑھتے چلیں، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ مدیر ماہنامہ ''برہان'' دہلی نے لکھا کہ:

''مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق، دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و فطانت خداداد اور فطری اور اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار، اس بنا پر علم و فن کی استعداد مفتی صاحبؒ کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکۂ تقریر وخطابت اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے، جس میں گنجلک یا الجھن نام کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا''۔

(ماہنامہ ''برہان'' ص:۵۳۳، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر)

جناب جمیل مہدیؔ مرحوم نے ان کی جرأت اور ہمت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''ان کی صلح کن فطرت اور مرنجانِ مرنج طبیعت کو دیکھ کر بعض لوگ انہیں کمزور اور بے ہمت سمجھتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا باہمت، جری اور بہادر آدمی ان کے معاصروں میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔''

(ماہنامہ ''برہان'' ص:۱۰، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر)

جناب احمد سعید ملیح آبادی (مدیر آزاد ہند کلکتہ) کا تأثر یہ ہے کہ:

''مفتی صاحب مرحوم ملتِ بیضا کی شمع تھے، ان کے رخصت ہونے سے یہ ایک روشن چراغ بھی گل ہوا اور اندھیرا بڑھ گیا ان کے دم قدم سے دنیائے علم میں جو رونق تھی وہ سونی پڑ گئی، ایک قیمتی متاع تھی، جسے موت ساتھ لے گئی۔''

(ماہنامہ ''برہان'' ص:۴۴، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر)

مولانا محمد حنیف ملی مرحوم نے مفتی صاحبؒ پر لکھے مضمون کا آغاز اس طرح سے کیا کہ:

''حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے وصال سے دلی کے ان علماء کی بساط خالی ہوگئی جو حرکت وعمل دعوت وعزیمت، درد وکرب، ایثار وقربانی اور فکر وخیال کی اپنی طویل اور حسین تاریخ رکھتے تھے، وہ میرِ میکدہ اٹھ گیا، جس کی ذات سے توحید کے متوالے توحید کے جام ایک جہاں کو تقسیم کرتے تھے''۔

(ماہنامہ ''برہان'' ص:۹۵، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر)

مفتی صاحبؒ کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں، جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور بلا تأمل یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی ہر ادا کو کسی ایک مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے، یہاں ایک بات رہی جاتی ہے، مفتی صاحب کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ''منارصدا'' کے نام سے ڈاکٹر عنوان چشتی صاحبؒ نے ترتیب دیا، مفتی صاحب کی یہ تقریریں علم وتحقیق کا شاہ کار اور ان کی اعلیٰ فکری وعلمی عظمتوں کا عنوان ہیں، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا قیام بھی ان کا بڑا کام ہے، جس کو مفتی صاحبؒ کی زندگی سے ایک نسبت حاصل ہے، مگر مشاورت کے قیام اور وجوہ واسباب پر تفصیلی گفتگو پھر کسی دوسرے موقع پر بھی کی جا سکتی ہے، کیونکہ میرے نزدیک مفتی صاحب اور مشاورت ایک

مستقل موضوع ہے، ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۰ء کو مفتی صاحبؒ اس عالمِ رنگ و بو میں تشریف لائے، تاریخی نام "ظفر الحق" تھا، ۱۹۸۲ء میں فالج کا شکار ہوئے، امراض میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ہر دن زندگی سے دور اور موت کے قریب ہو رہے تھے، بالآخر طویل اور مہلک بیماریوں سے لڑتے لڑتے ۱۲/ مئی ۱۹۸۴ء کو اس دنیا سے رخصت ہو کر دوسرے عالم کے مکین ہو گئے۔

حفیظؔ ہوگیا آخر اجل سے ہم آغوش
تمام شب کا ستایا ہوا سحر سے ملا

❁ ❁ ❁

ایک عظیم اور یادگار شخصیت

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے تکان کام کرتے چلے جاتے ہیں اور کبھی مڑ کر یہ نہیں دیکھتے کہ انہیں کیا ملا اور کتنا ملا، ان کا ایمان اور عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ کام کیجئے اور اجر کی امید اس ذات سے رکھئے، جو خالق عالم ہے، احکم الحاکمین ہے اور جس کے دربار سے کوئی مایوس اور محروم نہیں لوٹتا، اخلاص ان کی پونجی اور نیک نیتی ان کا اثاثہ ہوتی ہے، وہ کچھ ملنے کی خواہش اور کچھ پانے کے جذبے سے خالی ہوتے ہیں، ان کا مقصدِ زندگی انسانیت کی خدمت، دین کی اشاعت اور ملی دردمندی قرار پاتا ہے، ان کا علم، عمل، کمال، صلاحیت صرف تعمیری، فلاحی اور نیک کاموں پر صرف ہوتی ہے، زندگی کے ہر لمحہ کو گویا انہوں نے وقف کیا ہوتا ہے، دوسروں کے دکھ درد، ان کے مسائل، ان کی ہمدردی اور دوسروں کے لیے جذبۂ خیر یہی ان کی عظمت کی علامت بن جاتی ہے اور اسی میں وہ زندگی کا سکون تلاش کر لیتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کا شمار بھی ان ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے، جن کی علم و عمل اور تحریر و قلم سے وابستگی اتنی پختہ، مضبوط اور مستحکم تھی کہ ان کے بغیر ان کا وجود ہی بے معنیٰ سا تھا، انہوں نے نہایت محنت اور جدوجہد کے ساتھ اپنے لیے جو میدان منتخب کیا اس کے وہ اتنے کامیاب اور بلند اوصاف انسان بنے، جس کی تمنا ان کے معاصرین نے بھی کی اور ان کے چھوٹوں نے بھی ویسا ہی بننے کی دعائیں مانگیں، مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فرزند تھے، امام العصر حضرت

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ خاص، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ کے شاگرد رشید ہونے کا اعزاز انہیں حاصل تھا، اپنے ان گرامی قدر اساتذہ کے علم وعمل کی نمایاں جھلکیاں ان میں پائی جاتی تھیں، وہی درک، وہی تڑپ، وہی اضطراب اور بے قراری اور ملّی درمندی کے وہی صاف شفاف جذبات ان کا قیمتی سرمایہ تھے، مختلف النوع کاموں میں انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا ہمیشہ ثبوت پیش کیا۔

مولانا مرحوم کو راقم نے صرف ایک بار ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور شاید یہ مجلس شوریٰ کے اجلاس کا زمانہ تھا، جب وہ دیو بند تشریف لائے ہوئے تھے، ایک بار ان کو دیکھنے کا یہی پہلا اور آخری موقع تھا، پھر کبھی ان کی زیارت نہیں ہوئی، مگر ذہن کے کسی گوشے میں آج بھی ان کی دلکش، معصوم شخصیت کے نقوش ابھرتے رہتے ہیں، گو وقت کی تیز رفتاری نے ان نقوش کو دھندلا کر دیا ہے، مگر جب کبھی غور کرتا ہوں اور ذہن کو دوڑاتا ہوں، تو ان کا سراپا نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، بلاشبہ وہ ایک سادہ مزاج اور سادہ لباس انسان تھے اور کسی زاویئے سے بھی یہ نظر نہیں آیا کہ وہ ایک عظیم اور بلند شخصیت کے مالک ہیں، لباس کوئی خاص نہیں تھا، چال دلکش اور خدوخال جاذب نظر تھے، جتنی دیر ان کو دیکھنے کا موقع ملا اتنی دیر نگاہیں ان کا طواف کرتی رہیں اور ہر چکر پر ان کی علمیت، بزرگی اور دیدہ وری کے پردے اٹھتے رہے، مکمل تیس سال گذرنے کے بعد جب اس دن کا خیال کرتا ہوں تو دل میں ان کی عظمت اور بلند کرداری کا احساس ابھرتا اور پوری عقیدت اور احترام سے نگاہیں جھکی کی جھکی رہ جاتی ہیں، ہماری جماعت کے اس صاحب علم وفضل انسان کی داستانِ زندگی کے بیان کے لیے واقعی کسی ایسے صاحبِ قلم اور صاحبِ فکر شخص کی ضرورت ہے جو مختلف گوشوں میں بٹی ہوئی زندگی کو خوبصورتی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر زندگی کی گرمی اور حرارت بخشنے کا کارنامہ انجام دے، افسوس کہ اس صاحب فکر ونظر شخص پر زیادہ نہیں لکھا گیا اور جتنا لکھا گیا آج وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہے حالاں کہ ان کے احسانات ایک فرد سے لے کر

ایک جماعت پر قرض کی صورت میں واجب ہیں، اب دیکھئے یہ قرض کب اترتا ہے اور کس بندۂ خدا کے حصہ میں اس قرض کی ادائیگی کی سعادت آتی ہے۔

دیوبند کے مشہور خاندان سادات رضویہ میں ۱۹۰۳ء کو آپ کی پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، ۱۹۲۵ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی زمانۂ طالب علمی سے ہی ذکی و ذہین طلباء میں آپ کا شمار ہوتا تھا، اسی زمانہ میں آپ کی تحریریں ملک کے مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہوتی تھیں، اساتذۂ کرام کا آپ کو اعتماد حاصل تھا، آپ کی صلاحیتوں اور روشن مستقبل کا اندازہ لگانا کچھ مشکل کام نہ تھا، فراغت کے فوراً بعد آپ مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد بہار بحیثیت مدرس تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرا پڑاو ۱۹۲۸ء میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں اختیار کیا، لگ بھگ ۱۶/ سال اس ادارے میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۴۴ء میں مدرسہ امینیہ دہلی میں ۱۴/ سال بخاری شریف کا درس دیتے رہے، آپ کا درس بخاری اس دور میں بڑا معروف اور مشہور تھا، حضرت امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی علمی تحقیقات کا غلبہ تھا اور انداز درس اسی نہج پر قائم رہا، جو صرف حضرت شاہ صاحبؒ کے نام سے منسوب ہے، صحیح معنیٰ میں حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ ایک صاحب دل، صاحب فکر، صاحب علم اور صاحبِ کمال شخصیت کے مالک تھے، اور علم کی گہری چھاپ آپ کی پوری زندگی میں دکھائی دیتی ہے درس وتدریس کے علاوہ سیاسی وسماجی خدمات کا دائرہ بھی بے انتہاء وسیع ہے، اکابر دارالعلوم کی ملکی سیاست میں شمولیت اور علمی شرکت کی بناء پر آپ نے بھی بھرپور حصہ لیا، ۱۹۲۹ء میں سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر پانچ ماہ کی جیل ہوئی، مگر آپ کی ہمت اور توانائی ان بندشوں اور قیودات سے قطعی متاثر نہیں ہوئی آپ مسلسل مصروفِ عمل رہے، یہاں تک کہ تقسیم کا جان لیوا اور ہولناک دور بھی سامنے آیا، اس وقت بازآبادکاری کے مرحلہ میں آپ نے نمایاں کام انجام دیئے، آزادیٔ وطن کے بعد مستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اور جمعیۃ علمائے ہند کے مرکزی دفتر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

جمعیۃ کے ایک ذمہ دار اور فرض شناس شخص کی حیثیت سے بھی آپ کی زندگی قابلِ رشک ہے او یہ لکھنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ ان کی زندگی کا یہ حصہ نہایت کامیاب اور قابل ذکر حصہ ہے، اسی دور میں انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام پوری تندہی، عرق ریزی اور مستعدی کے ساتھ انجام دیا اور یہ امر بھی حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ ہجوم کار کے باوجود ان کے تصنیفی کاموں کا سلسلہ جاری رہا، ان کے تحریری کارناموں میں سو کے قریب تصنیفات ہیں، جو اپنے موضوعات کا مکمل حق ادا کرتی ہیں، ان کی چند کتابیں وہ ہیں جن کو بارگاہ الٰہی میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ ہر پڑھے لکھے انسان کی الماری کی زینت اور مطالعہ کا حصہ بنیں، ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' لکھ کر انہوں نے پوری ملت پر احسان کیا ہے اس کتاب کی اہمیت اور وقعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۱۹۳۷ء میں یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو من جانب حکومت اس پر پابندی لگی اور مقدمہ چلا، علمائے ہند کی یہ تاریخ بلاشبہ ایک عظیم کارنامہ ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ سے ہوتے ہوئے انہوں نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کے محیر العقول کاموں اور علمی خدمات کو اپنے دور کے علماء تک اس تحقیق تفصیل اور اعتبار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے بعد اتنی مفصل تاریخ شائع ہی نہیں ہوسکی، ان کی محنت دیدہ ریزی، کاوش و تحقیق کا ہر صفحہ گواہ ہے، پوری دیانت اور ثقاہت کے ساتھ یہ کتاب سپرد قلم کی، پھر علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے لکھ کر گویا اس موضوع کا انہوں نے تکملہ ہی لکھ دیا، سیرت مبارکہ سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے، جس کو علمی حلقوں میں خوب قبولیت حاصل ہوئی، تحریک شیخ الہند کو بھی ان کا منفرد کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

بچوں کے لیے انہوں نے ''دینی تعلیم کا رسالہ'' نام سے جو کتاب بارہ حصوں میں ترتیب دی، اس کا بدل آج تک تلاش نہیں کیا جاسکا، میرا ذاتی تأثر یہ ہے کہ یہ کتاب گو بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، مگر ۵ سال کے بچے سے لے کر ۵۰ سال کے آدمی تک کے لیے یہ کتاب مفید، کارآمد اور معلومات افزا ہے، اس کی زبان سادہ،

دلکش اور اسلوب خوبصورت ہے، کہیں الجھاؤ نہیں، سیدھا سادا اندازِ بیان، بات کہنے کا عمدہ سلیقہ اور قاری کے ذہن کے اعتبار سے گفتگو کا ملکہ ان کو حاصل ہے، اردو کی وہ چند کتابیں جنہیں دائمی شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی ان میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا ''بہشتی زیور'' حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ''تعلیم الاسلام'' اور حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا دینی تعلیم کا رسالہ شامل ہیں، ان تینوں کتاب کے ناشرین بھی شاید یہ نہ بتا سکیں کہ کتنے ایڈیشن ان کتابوں کے بازار میں آچکے ہیں، اگر حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ صرف دینی تعلیم کا رسالہ لکھ کر قلم اٹھا رکھتے اور کچھ نہ لکھتے تب بھی ان کی عظمت، ورفعت اور عند اللہ مقبولیت کا اظہار ہوتا رہتا۔

مولانا مرحوم نے مختلف جہات اور سمتوں میں کام کیا ان کی زندگی کا ہر ورق جہد و عمل اور سعی مسلسل کی گواہی دیتا ہے، فتنۂ ارتداد کے زمانے میں بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے، ہماچل پردیش، راجستھان، مشرقی پنجاب وغیرہ کے انہوں نے اسفار کیے اور اس فتنہ کی سرکوبی میں اپنی دینی حمیت کا بھرپور ثبوت پیش کیا، وہ ان لوگوں میں سے تھے، جو ایک ایک لمحہ کو کامیاب اور کارآمد بنانے کے فن سے واقف اور صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، تاریخی نام مظفر میاں تھا، اور نام کے اثرات ان کی حیات مبارکہ پر بخوبی دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو یہ مردِ مجاہد، میرِ کارواں آغوش رحمت میں جا سویا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا وہ تاریخی کارنامے جو آنے والی نسلوں کے لیے چراغ راہ ہیں ایک ایسا چراغ جو رات کی ہولناک تاریکیوں میں اجالے کا نقیب بنتا ہے اور عزم وحوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے، ان کا حادثۂ وفات یاد آتا ہے تو بے اختیار نوکِ قلم پر یہ شعر مچلنے لگتا ہے:

فنا کے بعد زندہ ہے، شانِ رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے میرِ کارواں تجھ پر

۞ ۞ ۞

علم وعمل اور شرافت کے پیکر

حضرت مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

دیوبند کو خداوند عالم نے جن علمی عظمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ تاریخ کا حصہ بھی ہیں، حال کا بیان بھی اور باوقار مستقبل کا آئینہ بھی، یہاں کی خاک سے وہ اہلِ علم اور مردِ مجاہد پیدا ہوئے جو مسلمانانِ ہند کی زندگی میں بنیادی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ خوش فہمیوں کا ابتلا نہیں، بلکہ حقائق کی وہ روشنی ہے، جو دور تک بہت دور تک بلکہ آخری حدود تک پھیلی ہوئی ہے، اندھیرے سراسیمہ اور خوف زدہ ہیں اور تاریکیاں ان کے قدموں کی چاپ سنتے ہی اپنا راستہ بدل دیتی ہیں، دیوبند کا یہ امتیاز اول دن سے آج تک باقی ہے اخلاص وللّٰہیت کی بستی میں علم وکمال کی آبادی میں اور فکر ونظر کی فصیلوں پر جب تک یہ چراغ جلتے رہیں گے چھ حرفی لفظ ''دیوبند'' ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

گذرنے والے ۲۵، ۳۰ سالوں میں جن اصحابِ علم کو ہم نے دیکھا ان میں ایک محترم نام شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندیؒ کا بھی ہے، ذہن کو بار بار ٹٹولنے اور یادداشت پر خوب زور ڈالنے کے باوجود یہ یاد نہیں آتا کہ حضرت مولانا کو پہلی بار کب دیکھا، ہاں حافظہ میں یہ اچھی طرح محفوظ ہے کہ انہیں متعدد مرتبہ دیکھا اور اتنے قریب سے دیکھا کہ ان کی بہت سی ادائیں، گفتگو، لباس وغیرہ آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے، حضرت مولاناؒ کا نام پہلی بار اس وقت سامنے آیا جب حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا وصال ہوا دارالعلوم ان روایتوں کی حامل کی شخصیت کا متلاشی تھا، جو نہ صرف دنیا سے رخصت ہونے والے حضرت مولانا فخر الدین

صاحبؒ کی جگہ پُر کر سکے؛ بلکہ اس سلسلۃ الذہب کی کڑی بھی ثابت ہو جو ہمیشہ اس منصب سے وابستہ افراد کا امتیاز رہی ہے، اربابِ اہتمام نے حضرت مولانا شریف حسن صاحبؒ دیوبندی کو یہ ذمہ داری سپرد فرمائی اور ذمہ داری نبھانے والے نے اس شان کے ساتھ ذمہ داری نبھائی کہ نہ صرف ماضی کی روایتیں زندہ ہوئیں؛ بلکہ مستقبل کے خدشات نے بھی دم توڑ دیا، وہ خلاء جس کا پُر ہونا ناممکن نظر آتا تھا، حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندیؒ کی صورت میں پُر بھی ہوا اور آسمانِ علم وفضل، نئی فضاؤں، نئی کیفیتوں اور نئے احساسات سے بھی آشنا ہوا دیوبند جن لوگوں کے نام سے متعارف ہے اور جن کی خدماتِ جلیلہ کا عالم اعتراف کرتا ہے وہ انگلیوں پر نہیں گنے جاسکتے، وہ اتنے ہیں اور اتنے مکمل ہیں کہ ہر ایک کی داستانِ حیات قرطاس وقلم کی بے پناہ وسعتوں کے باوجود بیان نہیں کی جاسکتی، ہاں ان کی زندگیوں کا اجمالی تذکرہ ہی ان مضامین کا مقصود اور ان جلیل القدر افراد کو خراج عقیدت پیش کرنے کا عنوان ہے۔

حضرت مولاناؒ کو خالقِ عالم نے علم، عمل، تقویٰ اور ورع کی ان خصوصیات کا حامل بنایا تھا، جو ایک صاحبِ علم انسان کا امتیاز ہیں، سادگی کا ایک ایسا پیکر جسے دیکھتے رہیے اور آنکھیں سیراب نہ ہوں سادگی ان کی فطرت اور سادہ زندگی ان کے خمیر میں شامل تھی، لباس سادہ، گفتگو سادہ، ظاہر سادہ، باطن سادہ، نہ کرّ وفر کا شوق اور نہ ممتاز نظر آنے کا جنون، رعب ودبدبہ اس سادگی میں بھی ہم رکاب رہتا سامنے آنے والے خود بخود راستہ بدل دیتے، جب کہ مولانا سڑک کے کنارے چلنے کے عادی تھے، استعداد ان کی قابلِ رشک، علم انکا مستحضر، حافظہ قوی اور مختلف علوم وفنون پر ان کی نظر گہری تھی، حدیث کے لیے جن علوم کا وجود لازمی ہے وہ اکثر مولاناؒ کے یہاں نظر آتے، تقویٰ وبزرگی، خلوص اور نیت کی سچائی ان کا اثاثہ تھی، یہی سبب ہے جب شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے تو نہایت کامیابی کے ساتھ بخاری شریف جیسی کتاب کا حق ادا کیا، دار العلوم میں درس حدیث کا وہ روشن سلسلہ بدستور قائم رہا جو

سیدنا حضرت شیخ الہندؒ سے ہوتا ہوا امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ تک پہنچ اور پھر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی صورت میں جاری رہکر حضرت مولانا شریف حسن صاحبؒ تک پورے وقار اور احترام کے ساتھ باقی رہا۔

حضرت مولاناؒ دارالعلوم کے ان فرزندوں میں سے تھے، جو اس ادارہ کی عظمت اور رفعت کا نشان ہیں، لمبا قد، خوبصورت چہرہ، گھنی داڑھی، آنکھوں میں علم کی چمک، پیشانی پر نور کی جھلکیاں، رفتار میں ایک وقار، چلتے تو قریب سے گذرنے والے کو خوشبو کا احساس ہوتا، گفتگو سلجھی ہوئی، بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ کلیاں چٹک رہی ہیں، لباس بیحد سادہ تھا، مگر اس سادہ لباس میں بھی محبوبیت کی شان تھی، اپنے معاصرین میں ان کو ایک بلند مقام حاصل تھا، رسالہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ:

> ''صورت شکل وجیہہ تھی جہاں بیٹھتے تھے چھا جاتے تھے اور چہرہ بشرہ سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ جید الاستعداد استاذ حدیث ہیں، ہنس مکھ ملنسار تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے ظاہر و باطن دونوں پاک تھے کسی کی طرف سے کوئی بات دل میں نہ رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قلب صافی عطا فرمایا تھا، تواضع اور فروتنی پائی جاتی تھی کبر و غرور کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا، علوم حدیث سے ایک استاذ میں جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں، وہ سب آپ میں پائے جاتے تھے اور بدرجہ اتم پائے جاتے تھے، بے تکلفی اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے گھر کا سودا سلف خود لانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں فرماتے تھے''۔

ماہنامہ ''دارالعلوم'' جولائی ۱۹۷۷ء

محنت کے عادی تھے مطالعہ کے بغیر کبھی درس نہ دیتے اور صرف متن کے حل کی ہی جانب نظر نہ رہتی؛ بلکہ حدیث کی حیثیت، اس کے راوی کے حالات، متقدمین.

ومتاخرین کی آراء، فرمان رسول کے منشاء اور مقصد کی وضاحت، مسائل کی رہنمائی
حسب ضرورت آیات قرآنی سے استدلال، گویا ان کا درس علوم عقلیہ ونقلیہ کا محور تھا
کسی گوشہ کو تشنہ نہ چھوڑتے اور نہ کسی پہلو کو نظر انداز کرتے ان کی درسی خصوصیات کے
بارے میں دارالعلوم کے ایک ممتاز فاضل برادر محترم مولانا عتیق احمد صاحب بستوی
کا بیان ہے کہ:

''آپ کا ذہن تمام اسلامی علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا تھا، جس
کے اندر ہر علم وفن کے ہیرے اور جواہر جمع تھے، دوسری طرف
مولانا اس بات کے حریص تھے کہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ علم کے
موتیوں سے مالا مال کردیں، آپ کا مطمح نظر صرف حلِ کتاب
نہیں تھا، بلکہ طلباء کے اندر حدیث فہمی کا ذوق پیدا کرنے کے
علاوہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس آخری سال میں طلباء کے سامنے
دوسرے علوم وفنون کی بنیادی اور کارآمد چیزیں بھی بیان کردیں
کثرتِ معلومات اور استحضارِ علوم کی وجہ سے ان کے درس میں
بات میں سے بات نکلتی تھی بسا اوقات وہ چاہتے تھے کہ بحث کو
اصل محور پر لیجا کر متعلقات کو چھوڑ دیں، لیکن پھر اسے علمی بخل سمجھ
کر اختصار ایجاز سے باز رہتے تھے''۔

ماہنامہ ''دارالعلوم'' ستمبر ۱۹۷۷ء

اور ایسا کیوں نہ ہوتا کثرت مطالعہ نے ان کو علم کی گہرائی اور رسائی کی ایسی
دولت سے نوازا تھا جو کم دیکھنے میں آتی ہے ان کے مطالعہ اور محنت کا اندازہ دارالعلوم
کے ایک اور ممتاز فاضل برادر مکرم مولانا ندیم الواجدی صاحب کے مضمون کے ان
جملوں سے لگایا جاسکتا ہے کہ:

''دارالعلوم کے کتب خانہ سے آپ کے نام ڈیڑھ سو سے زائد

کتابیں ہر سال جایا کرتی تھیں ان میں صحاح ستہ اور ان کی تمام
شروح و حواشی کے علاوہ درس نظامی میں شامل تمام فنون کی
بنیادی کتابیں شامل ہوتیں''۔

پندرہ روزہ ''مرکز'' دیوبند ۱۵/جون ۱۹۷۷ء

ان کی درسی خصوصیات اور علم کی پختگی کا علم برادر محترم مولانا ندیم الواجدی صاحب کے ان جملوں سے ہوتا ہے کہ:

''حضرت مولانا شریف حسنؒ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ممتاز
تلامذہ میں سے تھے، آپ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی
خدمت میں بھی رہے اور ان سے بخاری کے متعدد مقامات سبقاً
سبقاً پڑھے، حضرت مولانا مدنیؒ کے ذریعہ آپ کو حضرت شیخ الہندؒ
کے علوم پر گہری بصیرت حاصل ہوئی اور حضرت مولانا عثمانیؒ نے
آپ کو حضرت علامہ کشمیریؒ کے اسلوب سے نوازا''۔

پندرہ روزہ ''مرکز'' دیوبند ۱۵/جون ۱۹۷۷ء

دارالعلوم سے فراغت کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے طلب فرمانے پر آپ مدرسہ امدادالعلوم خانقاہ تھانہ بھون تشریف لے گئے جہاں صدر مدرس کی حیثیت سے ساڑھے تین سال قیام فرمایا، پھر اساتذہ کا حکم پاکر مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں صدر مدرس اور مفتی رہے، وہاں درس و تدریس کے علاوہ مناظرے بھی کئے، تقریریں بھی فرمائیں اور نہایت متانت، احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ علمی و دینی خدمات انجام دیں، دیوبندی اور بریلوی اختلافات کی آندھیوں میں آپ کا چراغِ علم روشن رہا، بیشمار لوگ بدعات سے تائب ہوکر آپ کے حلقے میں شامل ہوئے، وہاں سے سیدھے دیوبند پہنچے اور یہاں پہنچ کر صرف ایک مدرس عربی کا لیبل چسپاں کر کے زندگی نہیں گذاری بلکہ قائم مقام صدر مدرس رہے، قائم مقام

مہتمم کی حیثیت سے مختلف اوقات میں خدمت انجام دی، ناظم دارالاقامہ بھی رہے اور اہتمام کی شوریٰ کمیٹی کے رکن بھی، فرصت کا کوئی بھی لمحہ میسر نہ تھا اوقات مقررہ کے علاوہ بھی کام کرتے اور تمام امور خوش اسلوبی کے ساتھ پورے کرتے اتنی مختلف النوع ذمہ داریوں کے باوجود درسی مصروفیات قطعی متاثر نہ ہوتیں، وہ بے تکان کام کرتے اس کی وجہ سے ان کی صحت دن بدن گرنے لگی، ۵۶، ۵۷ سال کی عمر میں ہی وہ ضعیف العمر نظر آنے لگے، کمزوری اضمحلال نے ان کو ایک لمبی عمر کے انسان کی شکل دے دی تھی، صحت متاثر رہنے لگی، مگر آپ نے اپنے کاموں کی جانب سے بے توجہی اختیار نہ کی، ان کے علمی کاموں میں شمائل ترمذی کی عربی شرح ہے، نہ معلوم وہ آج کہاں ہے اگر ہے تو منظر عام پر کیوں نہ آسکی اور ان کے حلقہ تلامذہ نے اپنے گرامی قدر استاذ کی اس علمی امانت کی اشاعت کی کوئی کوشش کیوں نہیں کی، خدا کرے یہ شرح چھپ جائے تو یقیناً اہل علم کے لیے ایک تحفۂ علمی سے کم نہ ہوگی۔

۹ر اگست ۱۹۲۰ء کو آپ کا اس دنیا سے پہلا رشتہ قائم اور اور ۲ر جون ۱۹۷۷ء کو رات ساڑھے دس بجے تمام رشتوں سے ناطہ توڑ کر یہ کہتے ہوئے

قریب منزل آخر ہے الفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

اپنے حقیقی خالق کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

❀ ❀ ❀

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندویؒ

زندگی کا حاصل یہ ہے کہ ایک مختصر وقت کے لئے اس دنیا میں آنا اور پھر رخصت ہو جانا، آدمی اس دنیا میں آ کر رہن سہن کے طریقے اور زندگی گذارنے کا فن سیکھتا ہے کچھ سال اور کچھ مہینے یہاں گذلد کر رخت سفر باندھتا ہے اور پھر ایک کہانی میں تبدیل ہو کر بھولی بسری یاد بن جاتا ہے اور کبھی کبھی رخصت کے انمٹ نقوش اس انداز میں ثبت کرتا ہے کہ وقت کی گردشوں اور صبح و شام کی ہزاروں تبدیلیوں کے باوجود وہ نقوش دھندلے اور معدوم نہیں ہوتے۔

حادثات سے کسی کو مفر نہیں کبھی حادثہ ملکی سطح پر اور کبھی بین الاقوامی سطح پر دل و دماغ کو متاثر اور غم کی کیفیات سے دوچار کرتا ہے کبھی یہی حادثہ خاندان اور قبیلہ کے لئے درد و رنج کا باعث بنتا ہے اور کبھی انفرادی نوعیت کے اثرات مرتب کرتا ہے مگر ایک ایسا حادثہ جو پوری ملت اور طبقہ کے لئے ملال اور حزن کا سبب بنے جب وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس کے اثرات بھی دور تک دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی علیہ الرحمۃ کا حادثۂ وفات بھی امت کے ان نقصانات میں سے ایک نقصان تھا جن کا اثر بہت دیر تک محسوس کیا جاتا رہے گا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ حادثہ ہے امت اب جس کی متحمل ہی نہیں اور اس بارِ رنج والم کو اٹھانے کا وہ اپنے اندر حوصلہ باقی نہیں پاتی۔

حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ کو رخصت ہوئے کئی سال گذر گئے مگر وہ اپنی محبوب اداؤں، پاکیزہ اطوار، مجلّی اخلاق اور روشن عادات کی بنا پر آج بھی

ہمارے دلوں میں زندہ ہیں، ہماری مجلسیں ان کے تذکرہ پر مبنی اور ہمارے اوقات ان کی باتوں اور گفتگو سے خالی نہیں ہیں کوئی دن ایسا جاتا ہوگا جب اس خدا رسیدہ بزرگ، عالم باعمل، اور راہ تصوف و طریقت کے شیدائی کا ذکر نہ ہوا ایسا کیوں ہے؟ اس کے بیان کی اس لئے ضرورت نہیں کہ حضرت علیہ الرحمۃ اپنے گونا گوں اوصاف، اپنے پاکیزہ معمولات، اپنی سادہ اور صاف و ستھری زندگی کی وجہ سے بڑوں کے یہاں قابلِ احترام، معاصرین میں عقیدت کا مرکز اور چھوٹوں کے لیے قابلِ تقلید اور وجہ رشک تھے وہ روشن ضمیر بزرگ ہی نہیں، تصوف و سلوک کا عنوان ہی نہیں علم و کمال کی شناخت ہی نہیں بلکہ ان اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل تھے جو اللہ کے محبوب بندوں کا خاصہ اور اہل اللہ کا امتیاز ہیں ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے کرّ و فر کی زندگی اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کو تج کر سادہ اور معمولی زندگی کو اختیار کیا وہ اگر چاہتے ہر آسائش حاصل کر سکتے تھے ہر آرام ان کے لئے مہیا تھا، ہر راحت کو وہ اختیار کر سکتے تھے اور کیوں نہ کر سکتے جب کہ ان کے ہزاروں چھوٹے اور گمنام افراد تعیش بھری زندگی گذار رہے ہیں تو ان سب چیزوں کا حصول ان کے لئے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آسان اور سہل تھا مگر انہوں نے اس دنیا کے عارضی عیش و آرام کو قربان کر کے ان ابدی راحتوں کو انشاء اللہ پالیا جو ایک مردِ مومن کی طلب اور اس کا حقیقی سرمایہ اور ورثہ ہیں وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ایسی انجمن جہاں امیر و غریب، عالم و جاہل اور خاص و عام سب کی رسائی تھی اور ہر شخص آسانی اور سہولت کے ساتھ ان تک پہنچ سکتا تھا ان کے دروازے پر کوئی دربان نہیں تھا کہ روک ٹوک اور سوالات کی بھرمار کا سامنے کرنا پڑے وہ ہر وقت خدمتِ خلق کے لیے حاضر تھے اور ان کی ہر خدمت کے لئے تیار، خدمتِ خلق کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا ان کے وصال پر جہاں اپنے روئے وہیں غیروں نے بھی اس درد کو محسوس کیا ان کے یہاں غیر تھا کون سب ہی تو ان کے اپنے تھے اور پھر جس طرح وہ اجنبیوں

کے ساتھ پیش آتے چند ساعتوں ہی میں مغائرت ختم ہو جاتی اور ہر آنے والا اپنے آپ کو ان سے زیادہ قریب پاتا یہی ان کی مقبولیت و مرجعیت کی نشانی ہے۔

میرے نزدیک ان کا دوسرا وصف خصوصی یہ ہے کہ انہوں نے خانقاہ اور مدرسے کے ان رشتوں کو مستحکم کیا جو ہمارے اکابر کا خاصہ ہیں وہ خانقاہی بھی تھے شریعت وطریقت کے جویا بھی اور مدارس کے سرپرست اور خیر خواہ بھی، ہزاروں مدارس ان کی بلند شخصیت اور عظیم کردار سے فیض حاصل کررہے تھے وہ زاہدِ خشک نہیں ایک عالمِ بیدار تھے اور ان تقاضوں کو بخوبی سمجھتے تھے جن کی آج امت مرحومہ کو شدید ضرورت ہے سادگی کا ایک حسین پیکر اور نورانیت کا ایک ایسا جمیل وجود جس کی فیض رسانی حدود اور دائروں سے ماسوا تھی وہ طبقات کے گھیروں اور جھمیلوں سے نکل کر ان آبادیوں تک پہنچے جہاں واقعی کام کی ضرورت تھی اس ضرورت کی تکمیل انہوں نے اس احسن طریقہ پر انجام دی کہ آج ان کے کوچ کرنے پر اگر ایک طرف خانقاہیں سوگوار ہیں تو دوسری طرف مدارس اپنی محرومی اور لاچاری پر آمادۂ گریہ۔

خداوند قدوس جب اپنے کچھ بندوں کو اپنے کاموں کے لئے منتخب کرلیتا تو زمین پر اس کی حکمرانی کا اعلان فرمادیتا ہے، اور یہ حکمرانی تاج وتخت کی حکمرانی سے زیادہ پائیدار، زیادہ مستحکم اور زیادہ قابل رشک ہوتی ہے حضرت نور اللہ مرقدہ نے بھی دلوں پر حکومت کی اپنی زندگی میں بھی اپنی موت کے بعد بھی، وہ تھے تو دلوں کو تسکین، روحانیت کے ارتقاء، روح کی بالیدگی، ذہنوں کی تطہیر کا عمل جاری تھا وہ نہیں ہیں تو نیکی وفلاح اور دعوت خیر کا مشن اسی انداز میں چل رہا ہے دارالعلوم (وقف) سے ان کا تعلق روح کا تھا دل سے نکل کر روح کی گہرائیوں میں جو چیز جگہ بنالے وہ زیادہ مضبوط اور اٹوٹ ہوتی ہے اس تعلق کو انہوں نے ہر صورت میں نبھایا اور برقرار رکھا دیوبند تشریف لاتے تو دارالعلوم (وقف) سے تعلق کا اظہار کرنے کے

لئے ادارہ میں ضرور پہنچتے ادارہ کی ترقیات کے لئے دعا کا اہتمام فرماتے اور اللہ کے حضور اس مرکز علم کی تعلیمی وتبلیغی کامیابیوں کے لیے ہاتھ بلند کرتے اکابر کی روحانی توجہات اور تعلق کا یہ نتیجہ ہے کہ دارالعلوم وقف اپنی منزل کی جانب بتدریج گامزن ہے اور اس کا علمی سفر خدا کی مہربانیوں کے طفیل خوش اسلوبی کے ساتھ جاری ہے۔

حضرت مولاناؒ کا مزاج اور ذہن جس انداز کا تھا اس کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ اس کے متمنی اور داعی تھے کہ ہندوستان میں مدارس کا احاطۂ عمل وسیع ہو اور امت جس رہنمائی کی ضرورت مند ہے وہ رہنمائی اور روشنی مدارس سے اس کو ملے ان کی طبیعت میں غضب کا استغنا تھا دنیا سے بے رغبتی ضرب المثل تھی اپنی زندگی میں نہ معلوم کتنے رئیس اور کتنے امیر ان کی چوکھٹ پر پہنچے مگر کسی کو اپنی یا اپنے مدرسہ یا دیگر مدارس کی ضروریات کے لئے کبھی کچھ کہا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا اہل خیر آتے اور از خود مدرسہ میں رقمیں دے جاتے کہ یہ رقم اس مد میں اور یہ روپے مدرسہ کی اس ضرورت میں صرف کر لئے جائیں مدارس کے منتظمین اور ارباب اہتمام پہنچتے اور اپنے اپنے مدرسوں کے لئے تعاون کی اپیل یا دیگر صورتوں میں ضروریات کا اظہار کرتے تو اس مرحلہ پر بڑے وقیع اور مؤثر انداز میں ان کی اپیل لکھ کر دیتے اور حتی الامکان ان کی ضرورتوں کی تکمیل کی راہیں اختیار فرماتے اگر چاہتے تو اپنی ذات کے لئے لاکھوں کیا کروڑوں روپے جمع کر سکتے تھے اور ان کا بینک بیلنس ۸ ہندسوں کو بھی پار کر سکتا تھا یہ حال تو مدارس کے ساتھ تھا مگر غریبوں، ناداروں اور پریشان حال لوگوں کے لئے بھی ان کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا تھا کوئی سائل ان کی دہلیز پر پہنچا ہو اور مایوس لوٹا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کونسی ایسی صدا تھی جو خالی اور بے نتیجہ واپس آئی ہو ہر ایک کے لئے ان کے یہاں کچھ نہ کچھ موجود تھا جو بے تکلف پیش کر دیا جاتا۔

سفر ہو یا حضر دونوں حالتوں میں وہ اپنے معمولات کے پابند تھے سفر میں بھی سادگی کو اختیار فرماتے نہ خدام کا مجمع اور نہ ساز وسامان کا اہتمام، جس حالت میں

ہیں اسی حالت میں روانہ ہوتیتھے کھانے میں نہ تکلف اور نہ پر لطف غذاؤں کی خواہش دستر خوان پر جو آ گیا اسے نہایت رغبت کے ساتھ تناول کر لیا میلوں پیدل چل لیتے تھے سواری ہے تب یا نہیں ہے تب اپنی منزل پر پہنچ جاتے تھے وعدہ کے پابند، قول کے کھرے، اخلاق کے حسین پیکر، مروت اور رواداری کے خوگر، علم وعمل کی جیتی جاگتی تصویر، اکابر کی اداؤں اور روایتوں کے پاسبان، بزرگوں کے یہاں مؤدب، چھوٹوں کے لیے مشفق اور مہربان، حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کے یہاں حاضری بھی دیتے تو سراپا نیاز، ان کی گفتگو، ان کی ظاہری حالت، لباس اور انداز وعمل سے قطعی یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ شریعت وطریقت کی کن بلندیوں پر ہیں۔

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندویؒ اپنی تمام خوبیوں، کمالات اور خصوصیات کے ساتھ آسودۂ خواب ہیں اور مرقد مبارک مرجع خلائق ہے مگر جب تک زمین کے سینے پر زندگی کی رونقیں باقی ہیں بساط حیات پر انسان کی حرکت کا سلسلہ چل رہا ہے اس وقت تک یہ مردِ خدا، یہ ولی کامل، یہ عالم بے بدل پاکیزگیٔ اخلاق اور خوبیٔ کردار کا سبق دیتا رہے گا اور جہاں کہیں صدق وصفا، طہارت وتقویٰ کا ذکر ہوگا وہاں حضرتؒ کا نام ضرور لیا جائے گا اور ان کی یاد سے اپنے دلوں کو روشن کیا جائے گا۔

❁ ❁ ❁

مردِ حق آگاہ، چراغِ رہ گذر

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

جس دور میں ہم جی رہے ہیں یہ دور سستی شہرتوں کے حصول اور مادی دنیا سے گہری وابستگی کا دور ہے، انسان بھٹک رہا ہے اور دنیا کو پانے کی اس کی خواہش اسے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر رہی ہے، مگر اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں، روز صبح اٹھ کر خود دنیا جن کے دربار میں حاضری دیتی اور ہر شام ان کی چوکھٹ پر سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے، مگر مردانِ خدا آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھتے، اللہ کے محبوب بندے اس کی حقیقت کو جانتے اور ہر پل وفاداری بدلنے کی اس کی فطرت سے واقف ہیں، اس لیے وہ اس دنیا سے بے نیازی برتتے ہیں اور اس کو خاطر میں نہیں لاتے۔

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ ہماری جماعت اور ہمارے حلقہ کے وہ مردِ حق آگاہ تھے جنہوں نے دنیا کی بے ثباتی کو جان لیا اور پہچان لیا تھا، جتنی بے اعتنائی انہوں نے اختیار کی اس دور میں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتی ہوسکتا ہے کہیں اور بھی اس کا وجود ہو مگر اس کے وجود کا مجھے علم نہیں، میں نے صرف حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں اس کو بھرپور طریقے پر دیکھا، بات وہ قابل قبول ہوسکتی ہے جو تنہا ایک فرد کی جانب سے نہ ہو، بلکہ مخلوقِ خدا اس کی گواہ ہو اور بے شمار انسان اس کی شہادت کے لیے تیار ہو جائیں وہ مناظر آنکھوں کا سرمہ ہیں جو مفتی صاحب کے مسجد چھتہ کے قیام سے جڑے ہوئے ہیں خلوت گاہِ عابدی و قاسمی کی رونقیں تبھی لوٹیں، جب مفتی صاحب نے مسجد چھتہ کو اپنی قیام گاہ بنایا، حضرت مفتی صاحب کو میں نے اس وقت پہلی بار دیکھا کہ جب وہ دارالعلوم کے صدر گیٹ سے نکل

کر مسجد چھتہ کی جانب جاتے اور اِکا دکا طالب علم ان کے ساتھ ہوتا، پھر یہ ہوا کہ طلباء کی ایک بڑی جماعت ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی ان میں مولانا ابرہیم صاحب افریقی ضرور ہوتے ادھران کی عمر کی وہ منزل شروع ہوگئی، جوضعف وناتوانی کی منزل ہوتی ہے تواب ان کاحلقۂ اثر اور حلقۂ عقیدت کشادہ اور وسیع ہو چکا تھا اب صرف طلباء نہیں بلکہ اصحاب علم کثیر تعداد میں پروانوں کی طرح ان کے اردگرد جمع رہتے، چھتہ کی مسجد میں اب مفتی محمود صاحبؒ کی رہائش نہیں تھی؛ بلکہ شیخِ وقت، مردِ حق آگاہ، نمونۂ سلف، یادگارِ اکابر حضرت فقیہ الامتؒ قیام پذیر تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نیک صالح، متقی، پرہیزگار، دنیا سے بے رغبت، جاہ ومرتبہ سے بے نیاز انسان تھے اور شہرت وناموری سے دور تک ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا، ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کی زندگی کی شروعات ہوئی اور ایک مربی، ایک شیخ کامل، ایک عالمِ بے بدل کی صورت میں ملکِ عدم کے مسافر بنے قدم بہ قدم، مرحلہ بہ مرحلہ منزل بہ منزل ان کی زندگی کے شب وروز گذرے نہ کسی حادثہ نے ان کو منصبِ امارت پر لا بٹھایا اور نہ کسی ڈرامہ بازی سے وہ نامور ہوئے ان کی کتابِ زندگی کا ہر صفحہ اور ہر سطر محمود حسن سے مولانا محمود حسن، مفتی محمود حسن اور فقیہ الامت محمود حسن بننے کی گواہ ہے، جس طرح زمین کے سینے میں ایک بیج بویا جاتا ہے، ایک وقت گذرنے کے بعد وہ پھوٹتا ہے کونپلیں نکلتی ہیں اور چند سال میں وہ تناور اور سایہ دار درخت بن جاتا ہے، بالکل یہی فطری صورت ان کے ساتھ بھی پیش آئی۔

مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی فیض رسانیوں کا سلسلہ کافی دراز رہا، مقامی حضرات طلبائے علوم دینیہ، ہندوستان کے مختلف شہروں کے لوگ اور ممالک غیر میں بھی ان سے استفادہ کرنے والوں اور روحانی تربیت کی منزلیں طے کرنے والوں کی بڑی تعداد رہی، ان کی شہرتوں اور عظمتوں کی سچی کہانیاں، ان کی ذات سے عقیدت رکھنے والوں کو ازبر ہیں پورے سال دارالعلوم کے اردگرد روحانی ماحول بنا رہتا اور واردین وصادرین آتے

اس صاحبِ علم وفضل انسان کی مجلسوں میں دوزانو ہو کر بیٹھتے عصر بعد روحانی مجلس ہوتی، کبھی مفتی صاحب کچھ بیان فرماتے کبھی حاضرین سوال کرتے اور مفتی صاحب تسلی بخش جواب سے نوازتے، کبھی شرعی مسائل پر گفتگو ہوتی کبھی راہِ طریقت کی گتھیاں سلجھائی جاتیں، اسرارِ شریعت سے پردے اٹھتے، روحانی رموز سے آگاہی ہوتی، ذہانت ان کی ذات کا حصہ تھی، علم انکا وسیع اور گہرا تھا مشاہدہ اور تجربہ کی دولت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا، اکثر مختصر مگر مسکت جواب سے سائل کو مطمئن کرتے، اگر تفصیل وتشریح کی ضرورت پیش آتی تو اس سے بھی گریز نہ فرماتے۔

معمولات کے پابند تھے اور اوراد و وظائف، ذکر و اذکار سے ان کا رشتہ مسلسل اور مستقل استوار رہا، ان کی زندگی کے آخری پندرہ سال تو خاص طور پر دیوبند میں روحانیت کی بارشوں کا دور تھا، رمضان کے وہ مہینے جن میں مفتی صاحبؒ دیوبند میں رمضان گذارتے تھے خدائی رحمتوں اور عطائے ربانی کے مہینے ہوتے، اس ماہ کی رحمتیں اور عظمتیں آنکھوں سے دیکھی اور محسوس کی جاتی تھیں۔ مسجد اللہ کے بندوں سے پٹی رہتی، معتکفین کا جم غفیر، تلاوت کلام پاک میں مصروف ایک بھیڑ، تل رکھنے کی جگہ نظر نہ آتی، مفتی صاحب ایک مرشدِ کامل کی حیثیت سے ان کے درمیان موجود رہتے، رمضان کے آخری عشرہ میں تو ایسا لگتا کہ ایک دنیا سمٹ کر مسجد چھتہ میں سما چکی ہے اور زمین سے آسمان تک انوار و برکات کا سلسلہ قائم ہے۔

مفتی صاحب کو بڑی بڑی رقوم پیش کی جاتیں، اصحابِ ثروت خصوصی طور پر اس کا اہتمام کرتے، ایک لمحہ یہ ہوتا پھر اگلے ہی لمحے مفتی صاحب ضرورت مندوں، پریشان حال لوگوں اور یتیموں بیواؤں میں وہ رقم پیش فرمادیتے لوگ اپنی اپنی حاجتیں لے کر پہنچتے، تنگدستیوں کا شکوہ کرتے، تعاون کی درخواست کرتے اور مفتی صاحب کے خزانے سے سب کے حصے میں کچھ نہ کچھ آتا ان کی پوری زندگی اسی ڈھب اور انداز پر گذری، دارالعلوم سے تنخواہ بھی نہ لیتے، ان کی اپنی کوئی ضرورت تھی ہی نہیں

، جو کچھ آتا تقسیم کردیا جاتا، مال و دولت سے بس اتنی دیر کی قربت تھی، جتنی دیر میں وہ مفلس انسانوں کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔

بزرگوں کی سرزمین گنگوہ میں مفتی صاحب کی پیدائش ہوئی، ان کے والد حضرت مولانا حامد حسنؒ حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے، مفتی صاحب کی بسم اللہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کرائی، ان کے اساتذہ میں حضرت مولانا قمر الدین صاحب گنگوہی، حضرت مولانا مفتی ضیاء صاحب گنگوہی، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیمل پوری، حضرت مولانا سید عبد اللطیف صاحبؒ سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا عبیہ حق صاحب، حضرت مولانا ظہور الحق صاحب شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمہم اللہ جیسی علمی شخصیات کے نام شامل ہیں، حفظِ قرآن کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے، بیعت وارشاد کا تعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ سے قائم فرمایا، اساتذہ کا اعتماد اور اکابر کی قربتیں ان کو حاصل رہیں، اپنی صالح فطرت اور نیک طبیعت کی بناپر سب ہی حلقوں میں مقبولیت پائی، ہر جگہ انکا ادب واحترام کیا جاتا اور سب جگہوں پر وہ ممتاز نظر آتے، ۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم میں بحیثیت معین مفتی آپ کا تقرر ہوا، وہاں سے جامع العلوم کانپور صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے، ۱۹۶۵ء کو دارالعلوم میں تشریف لائے دارالعلوم میں آمد کے بعد کا تمام عرصہ مفتی صاحبؒ کے روحانی مرتبوں میں اضافے کا عرصہ ہے، یہاں سے ان کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ مرجعیت اور قبولیت حاصل ہوئی، ۳۱ سال کے زمانہ دیوبند میں مفتی صاحب نے ۱۲ سال بخاری شریف جلد اول کا درس دیا، حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ کی وفات کے سال مکمل بخاری آپ سے متعلق رہی۔

۲۰ر جولائی ۱۹۰۷ء کو مفتی صاحب نے نیلگوں آسمان کی پہلی جھلک دیکھی اور ۲۱ر اکتوبر ستمبر ۱۹۹۶ء کو ان کے سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی، اب جنوبی افریقہ کا دور افتادہ شہرِ خموشاں ان کا مدفن ہے ان کی بلند و بالا شخصیت، ان کا عظیم اور قابل ذکر کردار، ان کا علم و عمل، ان کی صالح اور لائق تقلید زندگی، ان کا تقویٰ اور پرہیز گاری، ان کی فراخ دلی اور سخاوت کے ہزاروں قصے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے لیے نمونۂ عمل ہیں، ان کی ضرورت گذرنے والے کل میں جتنی تھی اس سے زیادہ کہیں آج ہے اور آنے والے کل میں اس کا احساس زیادہ ہوگا۔

ضرورت جتنی بڑھ رہی ہے صبحِ روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جارہا ہے

۞ ۞ ۞

اکابرِ دیوبند کی شخصیت کا پرتو

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

انسانوں کی بھیڑ میں اپنی شناخت جتانا اور پھر اس شناخت کو قائم رکھنا ایک دشوار کام ہے اور یہ کام صرف وہی لوگ انجام دے پاتے ہیں جن کو خداوند قدوس خصوصی مقصد کی تکمیل کے لیے دنیا میں بھیجتا ہے۔ اس راہ پر بہت سے لوگ ابتدا ہی میں حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں کچھ چند قدم چل کر تھک جاتے ہیں اور کچھ آخر دم تک لڑتے اور جد و جہد کرتے ہیں اور راہ کی ہر رکاوٹ کو دور کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں وہی دراصل کچھ کر پاتے ہیں اور انکا نام زندہ رہتا ہے۔

حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کا شمار بلاشبہ ان ہی افراد میں ہوتا ہے جن کی پوری زندگی سعی و محنت، جد و جہد اور عزم و ارادے کی ایسی داستان ہے جس کے ہر ورق اور ہر صفحہ پر ایک مردِ مومن کی زندگی کا عکس جھلکتا اور ایک دردمند انسان کے نقوش ابھرتے ہیں۔ ایک ایسے مردِ مومن کی جھلکیاں جو رات کو شب بیدار اور دن میں بیدار مغز رہتا ہے ذاتی زندگی میں ایک نیک خو، خوش خلق اور ملنسار طبیعت کا مالک ہے تو اجتماعی زندگی میں دردمندی، خیر خواہی اور ہمدردی کا نمونہ ہے اس کے اوصاف اور کمالات کا دائرہ اتنا وسیع اور اس کے کاموں و کارناموں کی حدود اتنی کشادہ اور مختلف النوع ہیں کہ ہر سمت میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی زندگی کے مطالعہ کا حاصل یہی سامنے آتا ہے کہ انہوں نے خود کو دین اور ملت کے لیے وقف کر دیا تھا ملت کو جس رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی وہیں وہ آگے بڑھتے نظر

آتے ہیں میں یہ تو نہیں کہتا کہ انہوں نے بہت سوں کو پیچھے چھوڑ دیا لیکن یہ لکھنے میں حقیقت سے قطعی انحراف نہیں ہے کہ انہوں نے بہت سوں کو یہ ضرور بتایا اور سمجھایا کہ کام اس طرح کئے جاتے ہیں اور خداداد صلاحیتوں کا استعمال اس طور پر ہوتا ہے۔

ظاہری طور پر یہ قاضی جیؒ میں کوئی کشش نہیں تھی کسی بھی زاویے سے ان کے رنگ و روپ خدو خال اور لباس سے دل میں ان کی وجاہت کا کوئی اثر نہیں ابھرتا تھا اگر وہ بھیڑ میں ہوں تو ناواقف کے لئے بحیثیت مجاہد الاسلام ان کی پہچان آسان نہیں تھی مگر جب وہ بولتے، گفتگو کرتے اور علمی، تاریخی مسائل ومباحث پر لب کشائی کرتے تو سننے والے ان کی علمیت اور ہمہ گیری کے دل سے قائل ہوتے اور یہ ماننا پڑتا کہ ایک صاحب علم وفضل انسان ان کے سامنے ہے۔ قاضی جیؒ نے زمانۂ طالب علمی سے بڑی محنت کی تھی، مطالعہ اور علمی دنیا سے گہری مسلسل وابستگی نے ان کو علمی بلندیوں پر پہنچادیا تھا ایک نئے ذہن، نئی فکر اور جوان ارادوں کے ساتھ عملی دنیا میں پہنچے اور زندگی کا بیشتر حصہ بغیر پیچھے مڑے بڑی کامیابیوں کے ساتھ گزارا وقت کا کارواں گزرتا گیا اور قاضی جیؒ کی حیثیت اور مقام میں نمایاں اور قابل رشک تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں عمر کی ہر منزل ان کے لیے کامرانیوں کا ایک پیغام لیکر آتی یہ مقبولیت ان کی شب وروز کی محنتوں کا نتیجہ تھی اپنے معاصرین میں وہ اس لئے بلند قامت دکھائی دیتے ہیں کہ جس کام کو بھی انہوں نے چھیڑا پوری استقامت، لگن، اور دلجمعی کے ساتھ اس کو انجام دیا وہ کام کرنا بھی جانتے تھے اور کام لینا بھی، خود بھی مستعد تھے اور دوسروں کو بھی مستعد دیکھنے کے عادی تھے، زندگی کے یہ آخری دس سال ان کی علمی مستعدی کی مثال ہیں گو جسمانی طور پر لاغر سے لاغر ہوتے چلے گئے اور امراض کے لگاتار حملوں نے ان کے جسم وجاں کی تمام توانائیاں مضمحل کردیں مگر ان کی مصروفیت اور مختلف جہات میں ان کی مشغولیات سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ ان کاموں کا محرک وہ شخص ہے جس کی زندگی کی بساط سمٹتی جارہی ہے اور موت نے جس کے دروازے پر دستک دے دی ہے۔

قاضی جیؒ کی زندگی میں اکابر کی زندگی کا خاص اثر اور رنگ دکھائی دیتا ہے خصوصاً اکابر دیوبند کے حیات و احوال سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت کچھ پایا آپ اگر اکابر دیوبند کی خدمات کا جائزہ لیں تو اس نکتہ پر آپ کو اتفاق کرنا ہوگا کہ سب ہی نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور سب کی زندگی کا مقصد خدمت دین اور خدمت خلق تھا ہاں سمتیں الگ تھیں جہتیں جداگانہ تھیں طریقۂ کار مختلف تھا آگے بڑھنے کے طور وطریقے الگ تھے مگر سب کی منزل ایک تھی۔ راستوں کے تنوع سے کوئی فرق نہیں پڑا جس نے جو میدان منتخب کیا اس میدان میں ممتاز بن کر رہا اور آج جتنا کچھ بھی سرمایہ ہمارے پاس ہے اس میں کافی حصہ اکابر دیوبند کا بھی ہے ان کے اخلاق، ان کے عمل، ان کے کردار ان کے علم ان کے کمال، ان کے تقویٰ ان کی للّٰہیت ان کے جذبے اور ان کے ایثار کی اتنی مسلسل اور مربوط تاریخ ہے کہ زمان اور مکان کی قید سے اگر اس تاریخ کو آزاد کر دیا جائے تو قریبی وقت میں نہیں بلکہ پچھلی کئی صدیوں میں ہی اس کی نظیر مل پائے گی۔

ہر دور کے اپنے تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کو صحیح طور پر سمجھ کر قدم آگے بڑھانا بیداری، شعور اور دور اندیشی کی علامت ہے۔ ایسے مواقع پر کارآمد، متحرک اور فعال افراد کا سامنے آنا نعمت خداوندی ہے مسلمانانِ ہند کی زندگی میں ایسے مراحل بھی آئے جب انہوں نے خود کو مجبور، بیکس اور لاچار پایا مگر رحمت الٰہی نے مایوسیوں کے اندھیروں میں امید کے چراغ بجھنے نہ دیے، تحریک قیام مدارس کے لیے حجۃ الاسلام امام الاکبر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مسیحا بنکر سامنے آئے جن کے ابتدائی کارناموں کے دیرپا، دوررس نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ آزادی کی تحریک میں جس مجاہد کی ضرورت تھی وہ سیدنا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی صورت میں ہم کو ملا ان کی ریشمی رومال تحریک نے آزادی کی روح پھونکی اور یہ تحریک انتہائی نتیجہ پر پہنچنے سے بھلے ہی محروم رہی مگر سورج تو طلوع ہو چکا تھا صرف دن چڑھنے کا انتظار تھا غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اور آزادی کا سفر

شروع ہوا قادیانیت نے گمراہی کا جال بچھایا تو امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ پوری قوت اور جذبے کے ساتھ اس کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے ایک جماعت جس میں ان کے تلامذہ کی بڑی تعداد تھی اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے کمربستہ ہوگئی قادیانیت کا ہر جگہ پیچھا کیا گیا اور ہر محاذ پر اس کے حصہ میں شکست آئی یہ تحریکات اور سرگرمیاں ان اکابر دیوبند کی ہیں دین کی سربلندی اور ملک و وطن کی صحیح رہنمائی کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا تھا یہاں موازنہ مقصود نہیں اور نہ ہی ان تقدس مآب شخصیات کی تحریکات اور کارناموں کا موازنہ ممکن ہے مگر یہاں اس نکتہ پر نگاہ مرکوز رکھنے کی ضرورت ہے کہ پچھلے دور میں ان عظیم اور بلند و بالا شخصیات نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کی جھلکیاں ہمیں اپنے اس دور میں بھی دکھائی دیتی ہیں گو یہ دور افراد کی کمیابی سے دوچار ہے اور ملت دردمند و مخلص قیادت کے بحران سے گزر رہی ہے مگر پھر بھی ایسے لوگ ہمیں میسر ہیں جو کاموں میں مخلص اور اپنے ارادوں میں مضبوط ہیں۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری تھے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کی قیادت بھی ان کے ہاتھ میں رہی گو اس قیادت کا زمانہ زیادہ طویل نہیں مگر انہوں نے مستقبل کا جو خاکہ ہمیں دیا وہ ان کی فراست کی دلیل اور پیش آنے والے حالات پر گہری نظر رکھنے کا ثبوت ہے ان تمام امتیازات کے ساتھ ان کی فقہی خدمات میرے نزدیک زیادہ وقیع، باوزن، باوقار اور بھاری بھرکم ہیں اور ایک فرد جس سطح اور حد تک اپنے کاموں کو پھیلا سکتا اور سمیٹ سکتا ہے فقہ اکیڈمی نے ان کی نگرانی اور سرپرستی میں وہ سب کچھ کر دکھایا ملک بھر کے قابل، باصلاحیت، ذی علم، ذی رائے صاحب فضل انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر ایک مقصد کے تحت جمع کر لینا اور پھر ان سے کام لینا اور کام بھی خالص علمی اور تحقیقی کسی مجاہد کے کام سے کم نہیں ہے خوشی ہوتی ہے اور دل میں مسرت کی لہریں موجزن ہوتی ہیں کہ آج زمانے میں داد تحقیق دینے والی ایک جماعت ہمارے سامنے ہے جس نے خالص فقہی بنیادوں پر دور جدید کے مسائل

اورحالات حاضرہ کی پیچیدگیوں پر پوری نظر رکھتے ہوئے تحقیق کی راہیں ہموار کیں اور ایک ایسے نتیجہ پر پہنچنے کی مخلصانہ مساعی کیں جو مسلمانانِ عالم کے لیے خصوصاً اور مسلمانانِ ہند کے لیے عموماً اطمینان بخش ہی نہیں بلکہ نفع بخش ہیں اور یہ کلیہ ہے کہ جب اس طرح کی کوششیں ہوتی ہیں تو اختلاف رائے بھی ضرور سامنے آتا ہے مگر چونکہ اتفاق اور اختلاف دونوں کی بنیاد خلوص و دیانت پر ہوتی ہے اس لیے ان پر زیادہ گفتگو نہ تو مناسب ہے اور نہ ان پر ایک عام آدمی کو تشویش کا اظہار کرنا چاہیے یہ علماء کے درمیان کی چیزیں ہیں اس لیے بحث وتنقید کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہوتی ہے اور بولنے یا لکھنے کا حق بھی ان ہی کا بنتا ہے۔

قاضی جیؒ کی انتھک محنتوں اور غیر معمولی دلچسپی نے ہمارے مفتیانِ کرام اور علمائے باحترام کو سوچنے اور کچھ کرنے کی دعوت دی اور جو کام انفرادی طور پر انجام دیئے جارہے تھے وہ اجتماعی صورت میں سامنے آنے لگے آج بہت بڑا مطبوعہ ذخیرہ ہمارے سامنے ہے جس سے قاضی صاحبؒ کے رسوخ فی العلم اور رسوخ فی الدین ہونے کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے ان کی فقہی بصیرت و بصارت اور غیر معمولی درک کا اعتراف نہ کرنا قاضی صاحبؒ کے ساتھ ناانصافی کہلائے گا یہ میدان بلاشبہ ان ہی کا تھا اس میدان کے وہ مرد مجاہد ثابت ہوئے۔

میں نے بہت سی نامور شخصیتوں، صاحب نسبت بزرگوں اور جلیل القدر انسانوں کو قریب سے دیکھا اور ان کے علم وفضل اور کردار و عمل کا مشاہدہ کیا ہے قاضی صاحبؒ اسی صف کے لوگوں میں سے تھے ان میں ہر ادا اور ہر خوبی بڑوں کی سی تھی، تحمل، بردباری، سنجیدگی، متانت اور نیک جذبہ نے ان کی شخصیت کو خوب نکھارا اور سنوارا تھا عمر کے جس دوراہے پر وہ کھڑے تھے اس دوراہے کا اختتام مقبولیت اور مرجعیت پر جاکر ہوتا تھا اور آج انہوں نے جہاں ٹھکانا بنایا ہے خدائے واحد کی ذات سے امید ہے وہاں بھی رحمتوں اور نعمتوں سے وہ محروم نہیں رہیں گے۔

ایک خدارسیدہ بزرگ، ایک تابندہ علمی شخصیت

حضرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ صاحب

محرومیوں کا سلسلہ دراز ہے اور مایوسیوں نے پوری طرح پاؤں پسار رکھے ہیں علم و عمل کی دنیا میں ایک اور خلا پیدا ہوا، حکمت و دانائی کا ایک اور ستارہ آسمان سے ٹوٹا ایک اور شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ بھی رمضان کے مقدس مہینے اور آخری مسعود عشرہ میں واصل بحق ہو گئے، کہنے والے یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ ایک بلند انسان رخصت ہو گیا اور لکھنے والے یہ لکھ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ ان کی کمی پوری نہ ہو سکے گی، لیکن یہ سچ ہمیشہ سچ ہی رہے گا کہ مفتی صاحبؒ کی صورت میں فکر و عمل، تقویٰ و پرہیز گاری، صدق و امانت، خشیت و للّٰہیت کی جو ہفت رنگ اور نورانی مجلس جمی ہوئی تھی وہ بے رونق ہو گئی، وہ شمع گل ہو گئی، جس کی روشنی پاکیزگی کردار، پاکیزگی اخلاق اور پاکیزگی معاملات کو جلا بخشتی اور اس راہ کے سناٹوں کو چیرتی ہوئی بہت دور تک پہنچتی تھی۔

مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ اکابر کی روشن زندگیوں کا پرتو تھے اور خدا نے انکی ذات میں کچھ ایسی خوبیاں سمو دی تھیں، جو ان ہی کی ذات کا حصہ تھیں، یہ کہنا آسان اور یہ سمجھ لینا سہل ہے کہ فلاں آدمی عظیم ہے اور فلاں صاحب نسبت اور صاحب اخلاق ہے مگر یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ ان نسبتوں کا حصول کتنا دشوار اور اخلاق کا مسلسل مظاہرہ کس قدر نفس کشی کا طالب ہے بڑا کہلانے کا شوق تو بہت سوں کو ہے مگر بڑا بننے کے لئے کتنے ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اس کو صرف وہی جان سکتے ہیں جو واقعی اور حقیقی معنیٰ میں بڑے ہیں، مفتی صاحبؒ نے اپنی ذات کو مٹانے اور اپنی خواہشات کو

فنا کرنے میں بے انتہا ہمت اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا، ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا، ہر کسی کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا، ہر آنے والے کی جانب توجہ اور ہر پہنچنے والے سے گفتگو، سب کے لیے پیش قدمی کرنا، خاطر مدارات اور تواضع انکی خوبیاں تھیں، جن کو وہ اپنے ساتھ ہی لیکر رخصت ہو گئے۔

مفتی صاحب علیہ الرحمہ کو خداوند قدوس نے علم اور عمل دونوں کمالات، خوبیوں اور اوصاف سے نوازا تھا وہ بیک وقت ایک کامیاب مدرس، صاحب نظر فقیہ، دیدہ ور عالم اور خانقاہی سلسلوں کی مرجع خلائق شخصیت تھے اور ہر مسند پر اس طرح براجمان تھے کہ اس مسند پر ان ہی کی شخصیت جچتی اور ان سب کا وجود صرف ان ہی کے لیے موزوں تھا، علم حاصل کرنا، ذوق و شوق اور لگن و محنت کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہنا ان ہی لوگوں کا امتیاز ہے، جو واقعی علمِ دین کے لیے منتخب کر لئے جاتے ہیں اور جن میں اخلاص نیت کے ساتھ دین کی خدمت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، مفتی صاحبؒ نے محنت اور رغبت کے ساتھ پڑھا اور پھر اس پر عمل کرنے کے لئے کمر بھی کس لی، حق بات بھی یہی ہے کہ علم باقی بھی وہی رہتا ہے، جس میں عمل بھی صاف اور پاکیزہ ہو، عمل اگر علم سے میل نہیں کھاتا تو نہ وہ صاحب علم کے لئے نفع بخش ہوتا ہے اور نہ مخلوقِ خدا ہی کو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے مفتی صاحبؒ چوں کہ عالم باعمل تھے اس لیے تشنگانِ علوم خوب سیراب ہوئے، اصلاحِ باطن کے لئے بھی بیشمار لوگوں کا آپ کی جانب رجوع رہا، تھانویؒ سلسلہ سے آپ کا تعلق تھا، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب خلیفہ حضرت حکیم الامتؒ سے چوں کہ آپ کو خلافت (اجازت بیعت) بھی حاصل تھی اس لئے طلباء کے علاوہ عوام اور خواص بھی آپ کے یہاں حاضر رہتے اور دامن مراد بھرتے آپ کے والد صاحبؒ تفقہ میں مثالی تھے اس میدان میں مفتی صاحبؒ نے بھی امتیازی حیثیت حاصل کی اپنے والد کا بھی نام روشن کیا اور اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی بنائی۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ مفتی صاحب کے نام سے کان کب آشنا ہوئے ہاں دس

برس قبل ان سے پہلی ملاقات ضرور حافظہ میں موجود ہے، میرٹھ کے ایک مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں وہ تشریف لائے تھے ان سے نیاز حاصل کرنے اوران کا قرب پانے کے لئے مجمع بے چین تھا، وہ انتہائی سکون اور سکوت کے ساتھ جلسہ کی آخری نشست میں شروع سے آخر تک تشریف فرما رہے، ان کے قیمتی کلمات اوردل سوز دعاء کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا، یہ مفتی صاحبؒ سے ملنے اور انکو دیکھنے کا پہلا موقع تھا، ان کی شخصیت میں غیر معمولی کشش تھی جو ہر ملنے والے کوان کی جانب کھینچتی اور متوجہ کرتی تھی، پھر جس محبت، شفقت اور اپنائیت کے ساتھ وہ ملتے اور نرمی کے ساتھ گفتگو کرتے اس سے دل میں ان کی عظمت اور بڑھتی، زیادہ دیر تک ان کے پاس بیٹھنے کو دل چاہتا، وہ خاموش طبع، منکسر المزاج اور انتہائی متواضع انسان تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے کافی مواقع حاصل ہوئے، حضرت امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے حوالے اورنسبت سے ہمیشہ انہوں نے اپنی محبتوں اور کرم فرمائیوں سے نوازا، زمین اور آسمان جیسے واضح فرق کے باوجود جس خلوص کے ساتھ وہ پیش آتے اہل خانہ کی خیریت دریافت فرماتے اوردعاؤں سے نوازتے وہ ان کے انتہائی بلند اخلاق ہونے کی نشانی ہے۔

آخری بار وہ ماہ ستمبر ۲۰۰۳ء میں ایک شادی کے موقع پر دیوبند تشریف لائے تو ضعف، کمزوری پیرانہ سالی اور اضمحلال کی بناء پر سلام اور مصافحہ کرنے کے علاوہ کوئی اور بات نہ ہو سکی ان کے لئے خود سے چلنا بھی دشوار تھا نکاح پڑھایا اور شاید کچھ دیر کے بعد ہی وہ رخصت ہو گئے ان کی مسلسل بیماری کے باوجود یہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے گی، وہ دیوبند سے ایسے رخصت ہوئے کہ اب تمام عمر آنکھیں ان کو تلاش کرتی رہیں گی۔

مفتی صاحبؒ نے بے شمار تلامذہ، معتقدین، مریدین چھوڑے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ چند کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں، فضائلِ مسواک، فضائلِ تہجد، فضائلِ

جماعت، فضائلِ اعمال، جماعت مودودی کے عقیدۂ تنقید پر تبصرہ، الدر السنی فی حیات النبی، حاشیہ رسم المفتی طباعت کے مرحلہ سے گذر چکی ہیں، ابتدائی دو کتابوں نے بے انتہاء مقبولیت پائی، کئی معروف زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں، ملفوظات فقیہ الامت کے نام سے بھی کتاب فراہم ہے، ان ملفوظات کو پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کا اصلاح وتربیت کا خاص انداز تھا اور علم وتحقیق ان کے مزاج کا حصہ، دل چاہتا ہے کہ ان قیمتی اور نادر ملفوظات سے چند یہاں نقل کیے جائیں، مگر طوالت کا خوف ایسا کرنے سے مانع ہے۔

۱۳۴۸ھ کو مفتی صاحب نے اس دنیا میں پہلی سانس لی والدِ ماجد نے مظفر حسین اور احمد سعید نام تجویز کیے مگر اپنے تاریخی نام مظفر حسین سے ہی انہوں نے شہرت پائی، حضرت مولانا سید عبداللطیف صاحبؒ ناظم اعلیٰ مظاہر علوم، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ جیسی شخصیات آپ کے اساتذہ میں سے ہیں، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف کے علاوہ بخاری شریف بھی ایک عرصہ تک آپ کے زیر درس رہیں، حافظ بھی تھے اور خوش الحان قاری بھی، خداوند عالم نے جن مخصوص کاموں کے لیے پیدا فرمایا تھا ان کو زندگی بھر آپ نے احسن طریقہ پر انجام دیا، مفتی صاحبؒ کا جانا بلاشبہ ایک خدارسیدہ بزرگ اور ایک تابندہ علمی شخصیت کا جانا ہے، مگر انسان کے خمیر میں حیات وموت کی جو آمیزش ہے اور موت کا جو اٹل فیصلہ ہے اس سے مفتی صاحبؒ بھی دوچار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے شیرازۂ حیات منتشر ہو گیا، ان کے الوداع کہنے پر بار بار یہ مصرعہ سامنے آتا اور ایک بڑی سچائی کو باور کراتا ہے۔

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

۞ ۞ ۞

ایک عالم، ایک دانشور، ایک صحافی

حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ

گذرنے والوں کی یادوں میں کھو جانے، پچھلوں کا تذکرہ کرنے اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے والوں کے حالات بیان کرنے میں میرے لئے دلچسپی کا یہ سامان موجود ہے کہ یہ لوگ صاحبِ کمال تھے، صاحبِ قلم تھے، صاحبِ فیض تھے، صاحبِ کردار تھے، صاحبِ اخلاق تھے، بے ریائی، خلوص، جذبۂ دل اور روایتوں کو زندہ رکھنا ان کا مشن تھا وہ اپنے لئے نہیں جیتے تھے، بلکہ دوسروں کے لئے ان کی زندگی وقف تھی، انہوں نے لوح وقلم کا سودا نہیں کیا، وہ پیشہ ور ہونے کی تہمت ساتھ لیکر نہیں گئے، وہ علم وعمل کی دنیا میں متاعِ گراں مایہ بن کر رہے، وہ صحافی بھی تھے، ادیب بھی تھے، انشاء پرداز بھی تھے، شاعر بھی تھے مگر قیمت وصول کرنے کے لیے فن سے ناواقف اور تصنع وبناوٹ کی کسی راہ سے ان کا گذر نہ تھا۔

حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ ایک ایسا ہی نام ہے، جس کے قدموں کی چاپ اردو صحافت کے ہر پڑاؤ پر محسوس ہوتی ہے، وہ عالم، محقق، ادیب، صحافی، شاعر، انشاء پرداز ہر میدان میں ممتاز تھے اور ہر سمت میں ان کے قلم کی روانی اور جولانیاں دیدنی تھیں، دیوبند، ماہنامہ ''القاسم'' ماہنامہ 'الرشید' ماہنامہ ''تجلّی'' ماہنامہ ''ہادی'' کے قدیم دور سے لے کر ترجمان دیوبند، ماہنامہ دار العلوم، محدث عصر، دیوبند ٹائمز، اتباع سنت، شریکِ حیات وغیرہ کے زمانے تک سو سال سے زائد صحافتی اور قلمی سفر طے کر چکا ہے مگر حامد الانصاری غازیؒ کی صحافتی عظمتوں اور قلمی رفعتوں کو وہ پچھلے پچاس سال سے

خراج تحسین اور خراج عقیدت پیش کرتا رہا ہے، وہ معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی انسان تھے ان کی صلاحیتیں قابل ذکر ہی نہیں، ایک مثال تھیں، وہ اپنی ذات میں صرف انجمن ہی نہیں پورا ایک دور، ایک زمانہ، ایک روایت، اور ایک تاریخ تھے ان کے قالب میں ایک ایسا انسان ہمارے درمیان موجود تھا جس نے سیدنا حضرت شیخ الہند سے لے کر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے اکابر کے علم و فضل، تقویٰ وطہارت، اخلاق و کردار، جرأت و دلیری اور مومنانہ صفات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ان کے خاندان کے افراد علمی اور عملی دنیا کے قد آور انسان تھے، شعور کی پہلی منزل سے انہوں نے ان قدسی صفات انسانوں کے درمیان وقت گذارا جن سے ہماری دینی اور ملی تاریخ کا ایک اٹوٹ اور گہرا رشتہ ہے، ان کا گھریلو ماحول خالص دینی تھا اور ان کی ذہنی، فکری تربیت میں خالص دین پسند افراد کی شبانہ روز محنتیں شامل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر انتہائی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچے یہ دور دارالعلوم کی تدریسی زندگی کا نہایت تابناک دور تھا خاص طور پر علم حدیث میں امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی علمی حذاقتوں اور ہمہ گیریوں کا غلغلہ تھا غازی صاحبؒ نے چند سال دارالعلوم میں رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے بمبئی کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔

ان کی قلمی اور صحافتی زندگی کا آغاز اخبار ''مہاجر'' دیوبند سے ہوا جس کے وہ اور مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوری (بانی و مدیر اول نئی دنیا دہلی) مدیر رہے گو ''مہاجر'' کی عمر زیادہ نہیں ہوئی مگر کم عمر میں ہی اس کے مضامین اور مقالات نے اعتبار کی سند حاصل کی اور حامد الانصاری غازیؒ صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے فکر انگیز اداریوں نے اس وقت کے لکھنے والوں کو چونکا دیا، غازی صاحب یہاں سے رخصت ہوئے تو دوسرا صحافتی پڑاؤ روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی کی ادارت کی صورت میں سامنے آیا پھر بمبئی پہنچے تو اپنا ذاتی پرچہ ''جمہوریت'' جاری کیا، یہ بھی چند سال زندہ رہ

کر ابدی نیند سو گیا ان کی زندگی میں ایک اہم، باوقار، بلکہ عظیم موڑ یہ آیا کہ اپنے زمانے کے منفرد اور مشہور عالم اخبار، ''مدینہ'' بجنور کی ادارت کی ذمہ داری انہوں نے سنبھالی 'مدینہ'' کے زمانے میں غازی صاحب کی جوان، تازہ، دلکش، خوبصورت فکر انگیز نتیجہ خیز تحریروں نے ان کی فکری، ذہنی، علمی، تحقیقی صلاحیتوں کا ہر کسی کو قائل کیا اور ان کے انداز نگارش، بلند اسلوب، بالغ نظر، عمیق مطالعہ، اصابت رائے، حقیقی تجزیوں اور ٹھوس نتائج پر آگاہی نے ان کو اردو کے بلند پایہ صحافیوں اور قلم کاروں کی صف میں لا کھڑا کیا اردو صحافت کی تاریخ کا وہ حصہ جو آزادی سے کچھ پہلے شروع ہو کر آزادی کے دس پندرہ سال بعد کا احاطہ کرتا ہے یہی حصہ غازی صاحب کے عروج، کمال اور انتہائی بلندیوں کا حصہ ہے، غازی صاحب نے تحریر و قلم سے اپنی وابستگی ہمیشہ قائم رکھی اور ان رشتوں کو انہوں نے کبھی کمزور نہیں پڑنے دیا عمر کے آخر کا وہ حصہ جس میں وہ بالکل خاموش دکھائی دیتے تھے اس حصے میں بھی بمبئی کے روزنامہ اردو اخبار میں ان کے مقالات و مضامین شائع ہوتے رہے ہاں وہ ہماہمی، وہ جوش، وہ جذبہ، مفقود ہو چکا تھا، جو عمر کے ساتھ ساتھ کبھی کم اور کبھی یکدم ختم ہو جاتا ہے۔

غازی صاحب مرحوم کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں تھی کہ وہ ایک قلم کار تھے اور بحیثیت صحافی، انشاء پرداز اور ادیب کے انہوں نے شہرتیں حاصل کیں، بلکہ وہ ایک دیدہ ور عالم، ممتاز محقق، دانشور اور مفکر بھی تھے، انکا مطالعہ ان حدود میں داخل ہو چکا تھا جہاں حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں، انگریزی زبان سے بھی چوں کہ واقفیت تھی اس لئے ان کی تحریروں اور تقریروں میں اس کی جھلکیاں ملتی تھیں، بڑی رواں دواں تحریر تھی، من موہ لینے والا انداز بیان تھا، جملوں کی ساخت، اور دروبست کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا تھا، غازی صاحب کو میں نے تحریروں میں بھی دیکھا، تقریروں میں بھی دیکھا، اور گفتگو و ملاقات میں بھی مشاہدہ کیا ہر زاوئے اور ہر سمت سے وہ کھرے انسان تھے سیدھے، دردمند، خوردنواز ہر فریم میں ان کی تصویر بالکل فٹ آتی تھی تصنع

سے کوسوں دور، رعب اور دبدبے کے اظہار سے متنفر، ظاہری شان وشوکت سے بیزار، صاف دل، صاف ذہن اور صاف کردار شخص تھے، ظاہر کی نفاست باطن کی نفاست کی غماز تھی، زبان کے میٹھے عمل کے مخلص، ان سے گفتگو ہوتی تو اتنی دلچسپ، پر لطف اور معلوماتی کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا اور فراق کا یہ شعر چاہے وہ ایسے موقع کے لئے نہ ہو ذہن میں گونجنے لگتا۔

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

غازی صاحب کے اسلوب تحریر اور اسلوب بیان کو جاننے کے لیے جناب سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کے یہ چند جملے کافی ہیں کہ ــــــــ

جن لوگوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ تحریر اور مولانا ظفر علی خان کی پرشکوہ اردو سے متاثر ہو کر انہیں کا لب ولہجہ اختیار کیا ان میں غازی صاحب کا نام سرِ فہرست ہے لیکن انہوں نے بہت جلد اپنا ایک اندازِ نگارش پیدا کرلیا جس میں میر کا سوز و گداز، مولانا ابوالکلام اور ظفر علی خان کا شکوہ خسروانہ، جگر کی غزل کا مٹھاس اور غلام رسول مہر کے مقالات کا استدلال تھا۔

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص: ۱۲۵، ۱۲۶)

غازی صاحب کی متعدد تقریریں میں نے سنیں دارالعلوم کے دارالحدیث میں اور کبھی کسی درسگاہ میں ان کو بولتے دیکھا تقریریں کیا ہوتی تھیں ایک دریا تھا جو سبک خرامی کے ساتھ بہتا اور تشنہ لبوں کو سیراب کرتا چلا جاتا قرآن، حدیث، ادب، فلسفہ، کلام، ہر جہت سے گفتگو ہوتی اور ہر پہلو سے بات مکمل کی جاتی تقریر میں چاشنی ایسی کہ سنے بغیر چارہ نہیں موضوعات کے انتخاب میں انفرادیت تھی اور ہر موضوع کا حق ادا کرنے کی کمال درجہ کی صلاحیت تھی، سامع ان کی تقریر سے ایسا بندھ جاتا کہ اٹھنا تو درکنار حرکت وجنبش بھی اس کے اختیار میں نہ رہتی اور یہ کیفیت ہو جاتی کہ۔

چاہا بھی اگر ہم نے تری بزم سے اٹھنا
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

غازی صاحب ایک خوش فکر شاعر بھی تھے ۱۹، ۲۰، ۲۱/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو حکومت کشمیر کی جانب سے امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی حیات و خدمات پر ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی، حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ، حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ وغیرہ نے شرکت فرمائی ان کے علاوہ ملک کے ممتاز علماء محققین اور صاحبِ قلم افراد بھی شریک تھے اس سیمینار کے موقع پر غازی صاحب نے کشمیر کے تعلق سے کئی نظمیں کہیں جو وہاں شیخ محمد عبداللہ مرحوم وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر مولانا سعید احمد مسعودی مرحوم، میر واعظ مولانا فاروق صاحب مرحوم کی جانب سے دی گئی دعوتوں میں پڑھی گئیں اور ان کو بہت شوق اور جذبے کے ساتھ سنا گیا چند اشعار لکھتا ہوں

بڑی مدت کے بعد آیا ہوں اس شہر خوباں میں
بنامِ میگساراں یادِ یاراں لیکے آیا ہوں

عزیزانِ چمن ان آنسوؤں کو دیکھتے کیا ہو
میں ہر آنسو میں اک تصویر جاناں لیکے آیا ہوں

یہ سرزمین گل و گلعذار میری ہے
مرے نصیب یہ ساری بہار میری ہے

غازی صاحب کا بہت پہلے کا کہا ہوا ایک شعر ذہن میں محفوظ رہ گیا وہ کچھ اس طرح ہے

وہ بت اپنے ہاتھوں بنایا تھا جن کو
وہ بت اب ہمارے خدا ہوگئے ہیں

یہ صرف ایک شعر ہی نہیں بلکہ موجودہ اور گذرے ہوئے زمانے کی ایک سچائی اور ایک حقیقت ہے اور اس طرح کی تلخ داستانیں روز مشاہدے میں آتی ہیں، غازی صاحب نے خوب لکھا پڑھا لیکن اگر وہ صرف ''اسلام کا نظام حکومت'' لکھ کر تحریر و قلم کی دنیا سے علیحدہ ہو جاتے اور کچھ بھی نہ لکھتے پڑھتے تب بھی ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا ''اسلام کا نظام حکومت'' ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والی ان کی وہ علمی اور تحقیقی تصنیف ہے جس سے غازی صاحب کے مطالعہ، دقّتِ نظر، وسعتِ معلومات اور تحقیقی مزاج کا اندازہ لگالینا کوئی مشکل کام نہیں، علمائے دیوبند میں سے ایک عالمِ دین کی یہ وہ شاہکار تصنیف ہے جس کو کسی حکومت نے اپنے یہاں داخل نصاب کیا اور اگر میری معلومات غلط نہیں تو صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جس کی دنیا کے کسی ملک میں اس انداز میں پذیرائی ہوئی حکومت پاکستان نے اس کتاب کو باقاعدہ طور پر اپنے نصاب کا حصہ بنایا جس وقت یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو ایک اخباری تبصرہ میں کہا گیا تھا کہ:

> ''یہ کتاب ایک پیغام ہے خدا کی حکمت کا، پیغام ظلوم وجہول انسانوں کی ساختہ پرداختہ حکومتوں کے نام، عالمگیر امن وسلامتی کا پیغام ملکوں، قوموں، نسلوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی جنگ جو طاقتوں کے نام۔

حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ان کے ددھیال اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ان کے ننھیال کے بزرگ ہیں مولانا **عبداللہ** انصاری، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ان کے دادا تھے ان کے **والد مولانا محمد میاں منصور انصاری** مشہور مجاہد آزادی اور تحریک ریشمی رومال شیخ الہند کے ایک خاص رکن تھے اصل نام محمد میاں تھا مگر جب حجاز سے غالب نامہ لیکر ہندوستان آئے تو

پولس کی گرفت سے بچنے کے لئے اپنا نام منصور انصاری رکھ لیا اس طرح وہ مولانا محمد میاں منصور انصاری کے نام سے مشہور ہوئے مولانا محمد میاں منصور انصاری حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد مستقل طور پر افغانستان میں مقیم ہو گئے تھے افغانستان میں متعدد اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز رہے سیاست پر لکھی گئی ان کی چند کتابیں بڑی مشہور ہیں حکومت الٰہی، اساسِ انقلاب، دستور امانت، انواع الدول ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں آخر عمر میں جلال آباد (افغانستان) میں مقیم ہو گئے تھے وہیں ۱۹۴۶ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا"۔

غازی صاحب کی تحریر کا ایک نمونہ قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش ہے یہ نمونہ حکومت کشمیر کے زیر انتظام ہونے والے سیمینار کے لئے لکھے گئے ان کے مقالے، استاذ الاکبر حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ میرے مطالعات، مشاہدات سے لیا گیا ہے اور جس کا ذیلی عنوان ہے علامہ انور شاہ! سراپا!!

علامہ انور شاہ کشمیریؒ جسم، نور کی چادر میں لپٹا ہوا چہرہ مہتابی چودھویں رات کا چاند، رنگ خوب کھلا ہوا گورا، چاند کی چاندنی میں دُھلا ہوا، بزرگوں سے سنا کہ جوانی میں سیب کی طرح سرخ تھے ادھیڑ عمر میں رنگ ہلکا زعفرانی تھا، بڑھاپے میں سپیدی پر زردی سی چھائی رہتی تھی وصال سے پہلے زردی ہی زردی تھی پیشانی شاہی مسجد دہلی کی محراب کی طرح وسیع اور بلند تھی، آنکھیں معصوم اور کسی قدر مغموم نہ بڑی نہ چھوٹی، اکثر اوقات رکوع میں رہتیں جب قیام کے لئے اٹھتیں تو نورِ یقین کی چمک سے چاندنی سی پھیل جاتی حضرت کے ہونٹ گداز تھے خاموشی میں محبوبیت کی شان تھی بولنے میں محبوبیت کی یہ شان اور دوبالا ہو جاتی، قد نہ سرو تھا نہ صنوبر، نہ بڑا نہ چھوٹا بلکہ درمیانہ، تن بدن، نہ اکہرا نہ دہرا موزوں اور مناسب، سراپا میں عظمت و وقار و روحانیت کا حسن اور شخصیت کا جلال، چلتے تو راستہ بن جاتا نظر اٹھتی تو ہجوم کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور صراطِ مستقیم تیار ہو جاتی اور حضرت الاستاذ اپنے خاص

شاگردوں کے ساتھ گذر جاتے چال بہت ہی ہلکی، قدم بہت نرم اور بیحد نازک، اتنے نرم کہ چیونٹی قدموں کے نیچے آجائے تو درود پڑھتی ہوئی اپنی راہ چلی جائے جب چلتے تو نظریں نیچی رہتیں کبھی کبھی نظر اٹھا کر سامنے دیکھتے، راستے میں بات کرنے اور ادھر ادھر دیکھنے کی عادت نہ تھی چلتے ہوئے نظر کے ساتھ کمر ہلکی سی جھکی رہتی اس طرح قدم اٹھاتے جیسے پستی سے بلندی کی طرف جارہے ہیں درسگاہ سے قیام گاہ یا مسجد جاتے دونوں طرف شاگردوں کا صحیح معنوں میں عاشقوں کا ہجوم ہوتا دل چاہتا حضرت الاستاذ ہمارے سامنے سے گذرتے رہیں اور ہم عمر بھر دیکھتے رہیں، لباس! اتنا زیب ایسا کہ اب تک نہ دیکھا نہ سنا سر سے پاؤں تک سبز حلّہ، سر پر سبز رومال، بدن پر سبز رنگ چوغا، قدموں کو چومتا ہوا ایسا معلوم ہوتا کہ جنت کے سبزہ زار سے کوئی فرشتہ زمین پر اتر آیا ہے لباس کا سبز رنگ گہرا نہ تھا بلکہ کھلتا ہوا تھا تصور کے سات رنگ مشہور ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ساتوں رنگ ایک ذات اور ایک رنگ میں تحلیل ہوگئے ہوں سچ ہے کہ کشمیر کی طرح آپ بھی جنت نظیر تھے۔

۱۹۰۴ء شاہ غازی کے تاریخی نام سے اس دنیا میں قدم رکھنے والے حضرت مولانا حامد الانصاری غازی ۱۶/اکتوبر ۱۹۹۲ء بروز جمعہ اس دار فانی سے دار بقا کی جانب کوچ کر گئے ۸۸ رسال کی عمر پائی انبہٹہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے اور عروس البلاد ممبئی ان کی آخری آرام گاہ بنا ان کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے سے ہماری صف کا ایک ایسا انسان اٹھ گیا جو بزرگانہ اداؤں، قدیم روایتوں اور گذشتہ دنوں کی ایک یادگار تھا جس کے وجود سے ایک عالم مہکتا اور ایک دنیا مسحور رہتی تھی آج نہ غازی صاحب ہیں اور نہ ان کی یادگار مجلسیں اور یادگار شخصیت سب کچھ فنا ہونے کے لیے ہے اور صرف اس ذات کو بقاء ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

غازی صاحبؒ کے انتقال پر پندرہ روزہ ندائے دار العلوم نے اپنے ادارتی صفحات پر جو یہ لکھا تو بالکل صحیح لکھا کہ:

’’بیشک وہ بزمِ دانش و آگہی کے چراغ تھے، فکر و فن کی قندیل تھے، متاعِ لوح و قلم کا آبگینہ تھے، آسمانِ ادب و صحافت کا تابندہ ستارہ تھے اور کارگہہ حیات کی مشعلِ ہدایت تھے‘‘۔

اور لاریب کہ وہ جید عالم دین تھے، پاک باز مومن تھے، بلند نظر دانشور تھے، وسیع المطالعہ محقق و مفکر تھے، بلند خیال ادیب و شاعر تھے، صاحبِ فکر مؤرخ تھے، صاحب طرز انشاء پرداز تھے، صاحب نظر و نکتہ رس نقاد تھے، عظیم صحافی تھے، بیباک مجاہد آزادی تھے، بے داغ ملّی رہنما تھے، بے لوث سیاسی زعیم تھے۔

۞ ۞ ۞

علم وکمال کا مظہر، روایاتِ اکابر کا عنوان

حضرت مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہ

جہاں صدق وصفا کے پیمانے چھلکتے ہیں، جس کے دیار میں تقویٰ وللّٰہیت کے نورانی پیکر تراشے جاتے ہیں، جس کی گود میں علم کے دیوانوں، فکر کے سودائیوں کی پرورش ہوتی ہے، جو اہل کمال کو سینے سے لگاتی اور پیشانی کو بوسہ دیتی ہے، جو اصحابِ قلم اور اربابِ ادب کے لئے فرش راہ رہتی ہے، جس کے صحن میں دیانت وامانت کا اجالا ہے، جس کے در و دیوار پر نورانیت کی بارشیں ہوتیں اور جو تقدس و پاکیزگی اور رشد و روحانیت کی امین ہے وہ میری بستی ہے جو چہار دانگ عالم میں دیوبند کے نام سے متعارف ہے حقیقی معنی میں وہ مرکز علم ہے، منبع ہدایت ہے محورِ دیانت ہے، علوم نبوی کا سرچشمہ ہے، دین کی پاسداری کا مضبوط قلعہ ہے، جرأت وعزیمت کی شاہد ہے اور سب سے بڑھ کر یہ خدا رسیدہ انسانوں، انسانیت کے محافظوں، ایمان وعقیدے کے متوالوں کی بستی ہے جس نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں رہنمائی اور رہبری کی ہر سمت میں روشنی بکھیری ہے۔

اسی بستی کے خمیر سے ایک ایسے انسان نے وجود پایا جس کو خداوند عالم نے علم، عمل، کمال، تقویٰ کی دولتوں سے نوازا اور جس کو ہم حضرت مولانا محمد نعیم صاحب زید مجدہم (شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں، گذشتہ ۳۰ سے ۳۵ برسوں کے درمیان ہزاروں باران کو دیکھا، انگنت مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کے علم اور درس سے اکتساب فیض کا موقع ملا وہ آفتاب کی

روشنی ہے یا ماہتاب کی چاندنی، وہ ستاروں کی چمک ہے، یا بادنسیم کا نرم رو جھونکا ان کی ذات پچھلوں کی زندگیوں کا نمونہ تو اگلوں کے لئے ایک آئینہ ہے ایک ایسا صاف وشفاف آئینہ جس میں کردار وعمل کی زلفیں سنواری جاسکتیں اور بے علمی سے پیدا چہرے کی جھریوں کو علم کے غازے سے مٹایا جا سکتا ہے، دیوبند ان کے اجداد کی روحانیت اور تقدس کی بے شمار داستانوں کو اپنے سینے میں محفوظ کئے ہوئے ہے۔

حضرت مولانا محمد نعیم صاحب زید مجدکم نے تعلیم کی ابتداء دارالعلوم دیوبند میں کی دینیات سے عربی کی انتہائی تعلیم کا ہر مرحلہ دیوبند ہی میں طے کیا ان کا دور کئی اعتبار سے لائق رشک ہے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کو انہوں نے دیکھا علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد الیاسؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے مواعظ وتبلیغ سے استفادہ کیا، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی خدمت میں متعدد بار حاضر ہوئے، اپنے وقت کے کامل اور فقید المثال اساتذہ سے اکتساب علم کیا ان کے اساتذہ میں حضرت مولانا عبدُ الرحمٰن صاحب تلمیذ حضرت نانوتویؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا اعزاز علیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ جیسی باکمال علمی ہستیوں کے نام شامل ہیں حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے حجۃ اللہ البالغہ خارج میں پڑھی اولاً حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے اور ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ سے بیعت وسلوک کا تعلق قائم ہوا۔

۱۳۶۳ھ میں ابتداءً مدرسہ فیضان القرآن بنجاران سہارنپور کی نظامت فرمائی، ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی بھاولپور (پاکستان) میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس عربی آپ کا تقرر ہوا حافظ قرآن ہیں چالیس سال سے زائد تراویح میں کلام پاک سنایا تاریخی نام تنویر عثمانی یا اسکندر بخت ہے۔

حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دامت برکاتہم قدیم طرز کے وہ انسان ہیں سادگی جن کی فطرت کا حصہ، نفاست اور پاکیزگی جن کا مزاج، خاموشی اور متانت جن کا سرمایہ، کردار و عمل کی پختگی جن کی شناخت، علم و فضل کی عظمتیں جن کے ہمرکاب رہتی ہیں مطالعہ میں ایسا انہماک اور درس میں اتنا استغراق سنا تو ہے دیکھا صرف ان کے یہاں، استعداد ان کی ایک مثال، علوم عقلیہ ونقلیہ پر ان کی گرفت مکمل، تفسیر وحدیث میں ان کو ملکہ، منطق وفلسفہ میں درک، انداز گفتگو دلکش، آواز میں غنائیت، لب ولہجہ سنجیدہ، انداز درس ایسا جامع اور منفرد کہ اکابر کی یادیں تازہ ہوں، قہقہہ کا تصور تو کیا مسکرانے کا معاملہ بھی ندارد، ہاں مسکرادیں تو چمن میں بہار آجائے، مردہ کلیوں میں جان پڑ جائے، غنچے چٹکنے لگیں طلبہ کے درمیان مشہور کہ حضرت دامت برکاتہم مسکرائیں تو یقیناً ایک اچھوتا منظر، وقار اور تدبر کی حسین تصویر، نگاہیں ہمہ وقت نیچی، گردن اٹھا کر نہ چلنے کے عادی، اور نہ بات کرنے کے، بذلہ سنجی اور ظرافت سے بھی دوری نہیں، بلا کے حاضر جواب، چٹکیوں میں یوں اڑا دیں طلباء تو طلباء بڑے بڑے دیکھتے رہ جائیں شرافت کا غلبہ، لحاظ ومروت کے خوگر، روایتوں کو زندگی بخشنے والے، اکابر کی تدریسی زندگی کا ایک نمونہ، عمر کی ۸۵ ویں بہار دیکھ رہے ہیں ہر کتاب انہوں نے پڑھائی اپنے ۵۷ سالہ زمانہ تدریس میں لاتعداد اور بیشمار کتابوں کو انہوں نے کھنگال ڈالا، نوعمر طلباء سے لے کر ۵۰/۵۵ سال کی عمر کے تمام اساتذہ چاہے وہ ہندوستان کے کسی بھی مدرسہ میں ہوں براہ راست ان کے شاگرد، نسلوں کی نسلیں ان کے خوانِ علم سے خوشہ چینی کر چکی ہیں۔

نشست ان کی اتنی لمبی کہ رشک آئے چار چار گھنٹے پڑھانے میں نہ ان کو تامل اور نہ تھکن کے آثار نہ پہلو پر پہلو بدلتے دیکھے جاتے ہیں، ایک مخصوص انداز میں درس کے لئے تشریف فرما ہوتے ہیں اور پھر آخر تک اسی انداز میں درس دیتے ہیں نہ اکتاہٹ نہ چہرے پر کبیدگی کے آثار، مکمل نشاط کے ساتھ گھنٹوں ان کا سبق

جاری رہتا ہے مسائل کا استحضار، متن و حاشیہ پر گہری نظر، مراد مصنف کو حل کرنے کی خداداد صلاحیت، نہ الجھاؤ اور نہ ادق انداز بیان، بہت سہل اور دلنشیں تقریر، انگریزی میں جسے ٹو دی پوائنٹ کہتے ہیں بالکل وہ ہی اسلوب لیکن اطراف و جوانب سے بھی بے خبر نہیں افہام و تفہیم کی زبردست قوت، مؤثر طریقہ پر بات ذہنوں میں اتارتے چلے جاتے ہیں ان کی علمی عظمتوں کو دیکھا نہیں جا سکتا ہاں نگاہیں نیچی کر کے سلام کیا جا سکتا ہے

وقت کی صحیح قدر و قیمت کا اگر اندازہ لگانا ہو تو حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دامت برکاتہم کی زندگی کا جائزہ لیجئے زمانۂ طالب علمی سے آج تک اپنے اوقات کو جس منضبط طور پر انہوں نے گذارا وہ ایک صالح فطرت انسان اور صاحب علم و فضل شخصیت کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے اوقات عزیز کا ہر لمحہ اور عمر کا طویل ترین حصہ علمی کاموں اور علمی خدمات میں لگایا دنیا کے کسی تماشہ سے دلچسپی نہیں کسی ہنگامہ سے متاثر نہیں ہمہ وقت محنت، ہر لمحہ مطالعہ تحریز و قلم سے وابستگی اور کتابوں سے گہری دوستی ٹھہرنا ان کی عادت نہیں آگے بڑھنا اور ایک منزل کے بعد دوسری منزل سر کرنا ان کی زندگی کی بنیاد سوچ شاید ان کی یہی

ٹھہرو نہ ارادوں کی تھکن جاگ پڑے گی
ایک لمحہ کو رکنا بھی قیامت ہے سفر میں

درس و تدریس کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف، شرح و تفسیر سے ان کا تعلق مستحکم رہا ان کی قلمی یادگاروں میں تذکرۃ الحافظ، سلاسل حافظیہ، کمالین شرح جلالین، نور الدرایہ شرح ہدایہ، لطافت الانوار من اقتباس کاشف الاسرار، تفسیر انوار القرآن ۸ جلدیں کا نام نمایاں ہے علمی، دینی تحقیقی موضوعات پر ان کے قیمتی مقالات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے جو دیوبند اور ہندوستان کے مشہور زمانہ علمی پرچوں میں شائع ہوتے رہے وہ گذشتہ کافی سالوں سے امریکہ کے باسی ہیں مگر ادھر

دو سال سے پیرانہ سالی، کمزوری وضعف کی بناء پر دیو بند تشریف نہیں لا سکے یہ دو سال طالبان علم دین پر کٹھن گذرے ہیں دار العلوم (وقف) دیو بند کا دار الحدیث ان کے علمی زمزموں سے محروم ہے عمر کی جس منزل اور صحت کے جس دور سے وہ گذر رہے ہیں ایسے میں ان کا وجود ایک نعمت ہے ایک ایسی نعمت جس کا شکر بارگاہ ذوالجلال میں ادا کرتے رہنا چاہیے اس لئے کہ وہ ہماری صف کے ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ کہیں تو بجا کہیں گے۔

بھلا سکے نہ زمانہ وہ یادگار ہوں میں
بہارِ عہدِ گذشتہ کا راز دار ہوں میں

1919ء کو اس عالم آب وگل میں ان کا ورود ہوا اور آج تک ان کا وجود تقویٰ وطہارت، پاکیزگیٔ نفس، پاکیزگی حلم کی ضمانت ہے خدا کرے یہ سلسلہ یوں ہی دراز رہے اور وہ عمر کی اور بے شمار منزلیں طے کریں۔

☆ ☆ ☆

علم وفضل، دانش وبینش اور فکر وتدبر کی باوقار شخصیت

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی زید مجدکم

قدرت کی صناعی اور کاری گری کے لاتعداد شاہ کار اور بے شمار نمونے روئے زمین پر موجود، خدائے وحدہ لاشریک کی عظمت ورفعت کو زبانِ حال سے بیان کرتی عجیب وغریب مخلوقات اور انگنت صورتیں، ہر ایک کا رنگ جدا، ہر ایک کی کیفیت مختلف، کوئی زندگی کے ساز پر گائی گئی خوبصورت غزل، کوئی بربطِ حیات پر چھیڑا گیا حسین نغمہ، کسی میں چاندنی کا سکون، کوئی صبح دم چلتی ہوا کا مست کن جھونکا، کوئی آفتاب کی طرح زندگی کی حرارت کا اعلان، کوئی شام کی دلفریبیوں کی داستان، ہزاروں انسان مگر اپنی شکلوں، صورتوں، خصوصیات اور کمالات کے اعتبار سے قابل مدح اور لائق ستائش، سب پر خالق کی کرم فرمائیوں کے اثرات، ہر ایک اپنی ذات میں مجموعۂ اوصاف، صد ہا رنگ کے پھول، ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر اور عطر بیز، زندگی کی تعمیر جو ہاتھ خود کرتے اور کاروانِ حیات کو نئی جہتوں، نئی فضاؤں اور نئے آسمانوں سے آشنا کرتے ان میں ایک محترم نام ہمارے مخدوم و ممدوح حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی کا بھی ہے، جو ہر حلقہ میں ''شاہ صاحب'' کے نام سے متعارف اور ہر جگہ اسی انداز پر جن کی پذیرائی اور استقبال ۵رسال کی عمر، یتیمی کے دور کا آغاز مگر شیخ سعدی کی زبان میں

بالائے سرش زہوشمندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

ابتدائی عمر میں انگریزی تعلیم کے لئے دہلی کا سفر کیا، دہلی اس وقت شکست و

ریخت کے دور سے گزر رہی تھی مگر اہلِ علم اور اصحاب کمال کی موجودگی سے طالبین کے لئے اس میں کشش تھی، تعلیم شروع ہوئی اور کچھ وقت گزرا بھی مگر ۴۷ء کے ہنگامہ بلاخیز نے دیوبند آنے پر مجبور کردیا، پنجاب یونیورسٹی سے کچھ امتحانات دیئے گھر واپسی نے اس راہ کے دروازے بھی بند کردیئے، ازسرِ نو تعلیم کی ابتداء اور اب کی بار اسی میدان کا انتخاب جس میں ان کے نامور والد نے شہرت دوام حاصل کی، دھیمے قدموں سے سفر شروع کیا، ایک فرشتہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی صورت میں ظاہر ہوا اور ان کا ہاتھ تھام لیا اور ان ہی کی تربیت، ان ہی کی توجہ اور ان ہی کی محنت نے ایک یتیم کو جوہرِ قابل بنادیا۔

مولانا سید انظر شاہ صاحب نے پوری لگن، شوق اور جذبے سے از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ممتاز طلبہ میں شامل رہے، ان کی انفرادیت کے غنچے چٹکنے لگے اور علمی دنیا ایک نووارد کے قدموں کی چاپ محسوس کرنے لگی، ذہین، فطین، ہوشمند، بلا کا حافظہ، کچھ پانے کا سودا، کچھ حاصل کرنے کا جنون، آگے بڑھنا سیکھا تھا، پیچھے مڑکر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، زندگی کی سختیوں اور زمانہ کی ناہمواریوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتے رہے، بقول شاعر

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور اسی سال دارالعلوم میں مدرس عربی کی حیثیت سے ملازم ہوگئے، اول دن سے ان کی تدریسی صلاحیتوں کے چرچے شروع ہوئے، میزان سے ابتداء اور بخاری پر آکر ٹھہراؤ، مقامات ان کے زیرِ درس رہی، ملا حسن اور سلّم انہوں نے پڑھائی، جلالین اور بیضاوی ان کی نکتہ آفرینیوں کا مرکز بنی، مختصر المعانی، شرح عقائد اور ہدایہ میں پختگی کا ثبوت دیا، ترمذی، مسلم، ابوداؤد، مشکوٰۃ جیسی کتب احادیث بھی طویل زمانے تک

پڑھانے کی سعادت حاصل رہی، فقہ وحدیث، تفسیر وکلام، منطق وفلسفہ، معانی وادب ہر جگہ شہرتوں اور محبوبیت نے ان کے قدموں تلے پھول بچھائے ۵۲ر سال ان کی تدریسی زندگی کے گذر رہے ہیں، ان کے اندازِ درس اور طریقۂ درس نے مقبولیت کا دامن نہیں چھوڑا کسی فن میں نہ عاجز اور نہ کسی کتاب سے متوحش، ہر جگہ ان کی صلاحیتوں کے قطار اندر قطار چراغ روشن ہوئے اور ان کی روشنی طالبان علوم نبوت کے لیے ایک مثال بنکر سامنے رہی، خدا نے ذہن، فکر، حافظے اور افہام وتفہیم کی بے پناہ دولتوں سے نوازا اور قدرت کی ان فیاضانہ عنایات کا انہوں نے فیاضانہ استعمال کیا، دارالعلوم کے وہ چند نام جو اپنے علم وعمل، صلاحیت اور قبولیت میں شہرتوں کی منزلوں تک پہنچے ان میں شاہ صاحب کا نام نمایاں ہے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے وجود میں ایک ادارہ ہیں، اس انجمن کی روشنی روز بڑھ رہی ہے اور اس ادارہ کی وسعتِ علم سے دیوبندیت کے آنگن میں صحیح عقیدے اور مثبت فکر کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔

اپنے وقت کے نامور اساتذہ سے انہوں نے تعلیم حاصل کی اور ہر خوانِ علم سے خوب خوشہ چینی کی نہ کسی فن کی بیڑیوں میں جکڑے رہے اور نہ کسی خاص علم کی زنجیروں نے انہیں باندھے رکھا، مطالعہ انکا عمیق بھی ہے وسیع بھی اور بے پناہ بھی، زندگی کو جن اصولوں کے حوالے انہوں نے کیا ان میں سے ایک مطالعہ بھی ہے، ایام جوانی سے لیکر بڑھاپے کی اس چھاؤں تک نہ کبھی وہ اس سے بیزار ہوئے اور نہ بے توجہ، آج بھی گھنٹوں پڑھتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں اور تب جا کر بخاری جیسی عظیم اور اہم کتاب کا درس دیتے ہیں، خارجی مطالعہ بھی ان کے معمولات کا حصہ ہے، زندگی کیا ہے؟ کیا کوئی معمہ ہے، کوئی چیستاں ہے، کوئی لاینحل مسئلہ ہے، ایسا کچھ بھی نہیں، شاہ صاحب کی زندگی کے نشیب وفراز سے جو لوگ واقف ہیں اور ان کی شبانہ روز جد وجہد پر جن کی نظر ہے وہ زندگی کو ایک کھلی کتاب کی

طرح دیکھ سکتے ہیں کیسے انسان کی محنت اور جانفشانی کی کلیاں چٹکتیں اور پھول بنتی ہیں، تدریس کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ تحریر و قلم اور تقریر و خطابت میں ان کی امتیازی شان ہے، دونوں میدانوں میں وہ اس قافلہ سالار کی طرح ہیں، جس کے پیچھے چلتے قافلے اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دیتے ہیں اور اس کے قدموں کے نشانات پر چل کر ہی وہ منزل پر پہنچتے ہیں۔ دارالعلوم کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے علوم و کمالات کے وہ گوہر پیدا کیے جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے تحریر ان کی اتنی اجلی، اتنی پاکیزہ، اتنی صاف شفاف، اتنی رسیلی، اتنی میٹھی، اتنی شیریں کہ خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ اپنا لطف کھو بیٹھے اتنی پر شکوہ، اتنی جاذب نظر کہ ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا سحر ٹوٹتا نظر آئے، عمق اور بلندی اس درجہ کہ مناظر احسن گیلانی کی تحریروں کی چاشنی ذائقہ کا حصہ بن جائے تحریر میں وہ کسی کے مقلد نہیں اپنا ہی انداز اپنا ہی اسلوب وہ بھی اتنا جداگانہ اور متنوع کہ چاہنے کے باوجود اس اسلوب تک رسائی ممکن نہ ہو، ہزاروں مقالات و مضامین ان کے گہر بار قلم سے نکلے اور تا حال سلسلہ دراز ہے، علم کی گہرائیوں، معلومات کی ہمہ گیریوں کے ساتھ تاریخ اردو ادب پر بھی ان کا مطالعہ قابل رشک ہے، ہماری صف کے لوگوں کے مقابلہ میں اردو ادب کے مختلف ادوار، مختلف عظیم ادبی شخصیات، ان کے ادبی کمالات اور ان سب کے مابین بنیادی فرق اور امتیازات کو بھی وہ خوب جانتے اور پہچانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کبھی ان کی تحریریں غالب کے خطوط کی یادیں تازہ کرتیں اور کہیں قلعۂ معلٰی کے اردو نمونے بن کر سامنے آتی ہیں، لکھنا ان کے لیے اتنا ہی سہل جتنا دوسروں کے لیے لیٹنا، سونا اور لذتِ کام دہن میں مصروف ہونا ہر موضوع پر دادِ قلم دی اور ہر عنوان کو نکھارا اور سنوارا علمی موضوعات سے لے کر حالات حاضرہ پر بھی وہ جچی تلی رائے کا اظہار کرتے اور ان کی رائے میں وزن بھی ہوتا ہے، فکر بھی سچائی بھی۔

ان کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔

۱- تذکرۃ الاعزاز سوانح حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

۲- ایمان کیا ہے؟ ترجمہ تکمیل الایمان مصنفہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔

۳- طریقۂ تعلیم ترجمہ تعلیم المتعلم مصنفہ الامام برہان الاسلام (الزرنوجی) تلمیذ صاحب ہدایہ۔

۴- فروغِ سحر مجموعۂ مضامین۔

۵- گل افشانیٔ گفتار مجموعۂ تقاریر۔

۶- خطباتِ کشمیری مجموعۂ خطبات۔

۷- نقشِ دوام سوانح امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ۔

۸- لالہ و گل شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ۔

۹- اسمائے حسنٰی کے برکات۔

۱۰- تفسیر ابن کثیر پر وقیع اور علمی کام۔

۱۱- بیضاوی کے ایک جز کی شرح وترتیب بنام ''تقریر شاہی'' وغیرہ کے علاوہ چند کتابیں زیر تالیف ہیں ان کے زیر ادارت ماہنامہ ''نقش'' اور پندرہ روزہ ''یثرب'' ایک طویل عرصہ تک شائع ہوئے آج کل ماہنامہ ''محدث عصر'' ان کی قلمی جولانیوں کا ثبوت ہے، تصنیفات وتالیفات پر ان کی تقریظات اور مقدمات کا شمار سو دو اب ممکن نہیں۔

تحریر وقلم سے ان کی وابستگی جتنی قریبی، پختہ اور مضبوط تقریر وخطابت سے بھی اتنی ہی قربت، اتنی ہی نزدیکی، اتنی ہی منفرد اور مہتم بالشان، وہ خطابت کی دنیا کے تنہا ایسے مقرر جن کے لب ولہجہ اور اندازِ گفتار کو اختیاری اور غیر اختیاری طور پر ہزاروں نے اپنایا مگر چند قدم چلنے کے بعد سب نے حوصلہ ہار دیا، وہ اپنے انداز کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم بہت سوں نے انظر شاہ بننے کی کوشش کی مگر بقول استاد ذوقؔ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

گذشتہ ۳۵ رسال سے میں ان کو سن رہا ہوں ہزاروں کے مجمع میں بھی سنا، مختلف تقریبات اور پروگراموں میں بھی شرکت کی، عظیم الشان اجتماعات میں بھی شریک ہوا، شاہ صاحب ہر صورت میں شاہ صاحب ہی ثابت ہوئے غلہ اسکیم کے جلسوں میں، دیوبند کے محلوں اور دیگر مواقع پر ان کی تقاریر کی گونج ہے، مجمع صرف ان کو سننے کے لیے جمع ہوتا اور ان کی تقریر کے اختتام پر اپنے گھروں کولوٹنے لگتا ہے جوشؔ ملیح آبادی کے بارے میں کسی نے لکھا تھا کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ (مجھے یہ تعبیر کبھی پسند نہیں آئی) الفاظ شاہ صاحب کے اردگرد پروانوں کی طرح پوری وارفتگی، پورے جذبے کے ساتھ چکر لگاتے ہیں، کب ان کی نظر کرم ہو اور ان کی نوک قلم اور نوکِ زبان سے ادا ہونے کی سعادت حاصل ہو، علوم کا گنجینہ، معلومات کا خزینہ ان کے مواعظ اور خطبات کی شان ہی نرالی ہے، ابوالکلام آزاد کی سحر انگیز خطابت، عطاء اللہ شاہ بخاری کی گھن گرج، حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا استدلال، حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی مہارت، شبیر احمد عثمانی کی طلاقت لسانی نے اگر کہیں ٹھکانا بنایا تو وہ شاہ صاحب کی ذات ہے، جنوبی افریقہ، کینیڈا، پناما، ویسٹ انڈیز، برطانیہ، شارجہ، دبئی، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سعودی عرب، ماریشس، ریونین وغیرہ ممالک کی زمین ان کے مضبوط قدموں کی دھمک اور اعلیٰ خطبات وتقاریر کی چمک اپنے قلب اور اپنے سینے پر محسوس کرتی ہے، ہندوستان کے ہزاروں اسفار، ۵۲ رسال کے عرصہ میں ہزار ہا ہزار جلسوں اور اجتماعات میں انکی شعلہ بیانی کے ہمیشہ سے چرچے غرض دورِ آخر میں شاہ صاحب جیسا دوسرا کوئی مقرر اور خطیب اپنی تقریر اور خطابت کا ایسا سحر قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور بات یہیں آکر ٹھہری

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

اپنے وقت کے باکمال انسانوں ،نامور شخصیات ،سرکردہ لوگوں، برگزیدہ افراد اور عالمی سطح کی شخصیات سے ان کے تعلقات بھی رہے اور مراسم بھی، حاضری اور ملاقاتیں بھی سب نے ان کو سراہا، سب نے ان کو چاہا اور سب نے ان کو سینے سے لگایا، متعدد بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے ہیں، علمِ حدیث پر خداوند قدوس نے ان کو خصوصی نظرعطا کی اور وہ آج ممتاز محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، عزم اور ارادہ ان کی زندگی کا حسین عنوان ہیں، ایک طوفان بھی ان کی زندگی میں آیا ایسا طوفان کہ جس میں

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

یہ طوفان تھا یا اپنی بقا کی جنگ، یا معرکۂ کرب و بلا ان سب سے زیادہ موزوں یہ کہ خود کو ٹوٹنے ،بکھرنے ،اپنے اور جماعت کے وجود کو ریزہ ریزہ ہونے سے محفوظ رکھنے کا ایک مسلسل اور مستقل عمل ہمیشہ روشنی کی تلاش رہی اور جب صدق وصفا کے چراغ ہتھیلیوں پہ سجا لیے تو یہ عمل

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا

ان پر لکھنے کے لیے بہت کچھ باقی اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر خامہ فرسائی کے لیے دوسری صحبت بھی درکار ۱۹۲۸ء کو انہوں نے عالم امکان کا پہلا جلوہ دیکھا اور تب سے آج تک علمی عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ مناظرِ قدرت ،مناظرِ عالم، مناظرِ فطرت سے ان کا ذہن ،ان کا قلب ،ان کی روح، ان کی آنکھیں اکتسابِ نور کر رہی ہیں۔

۞ ۞ ۞

روایتوں کے پاسدار

مولانا قمر عثمانی

اگر آپ کسی ایسے شخص سے ملاقات کے خواہش مند ہیں جو سادہ طبیعت، سادہ مزاج اور سادہ لباس ہو اور اگر آپ کی خواہش اور آرزو یہ ہو کہ ایک ایسے آدمی سے آپ کا ٹکراؤ ہو جائے جو صاحب قلم بھی ہو، صاحب علم بھی ہو اور صاحب فکر بھی ہو تو ہم آپ کو اس کا پتہ بتا سکتے ہیں، انسانوں کی بھیڑ میں ایسے افراد کا وجود اب غنیمت کے درجہ میں ہے، جب پورا معاشرہ اخلاقی کمزوریوں اور کردار کی گراوٹوں کا شکار ہو، جب بڑائی کا معیار صرف دولت اور نری شہرت قرار پائے اور جب اخلاص اور دل کی سچائیوں کے ساتھ خدمت کرنے والوں کو ایک بڑا طبقہ ذہنی بیمار کا نام دینے پر آمادہ ہو ایسے میں جب ہم مولانا قمر عثمانی صاحب جیسے انسان سے ملتے ہیں تو روح کو طمانیت، دل کو تازگی، ذہن کو انتہائی سکون کا احساس ہوتا ہے یہ اس نسل کے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کچھ پانے کے لئے تحریر و قلم اور علم و ادب کے رشتوں کی آبیاری نہیں کی بلکہ خونِ دل اور خونِ جگر سے فکر پاروں کی تخلیق کا کام انجام دیا اور اپنی ذہنی و فکری صلاحیتیں کچھ دینے میں صرف کیں۔

مولانا قمر عثمانی صاحب دیوبند کی مٹی میں پیدا ہوئے، یہاں کی علمی و ادبی فضاؤں میں جن کی پرورش ہوئی، صاحبِ علم اور صاحبِ کمال افراد سے جنہوں نے اکتسابِ فیض کیا دارالعلوم دیوبند کے علمی ماحول میں تعلیمی زندگی کا آغاز اور انتہا ہوئی، اپنے دور کے نامور لوگوں سے کچھ حاصل کرنے کی لگن اور جذبے نے ان کی علمی و فکری زندگی کو آگے بڑھایا اور آج عمر کی ۶۸/ بہاریں دیکھنے والے قمر عثمانی ایک خوش بیان

خطیب، ایک مقبول مقرر، ایک کام یاب واعظ، ایک ممتاز ادیب، ایک صاحب فکر شاعر
اور ایک ماہر مدرس ہیں علم وادب کی مختلف اور متضاد سمتوں میں ان کا سفر قابلِ رشک
ہے۔ فکر جوان، ذہن تازہ اور شعری کارنامے زندہ اور متحرک ہیں، جمود اور تعطل کا ان
کے یہاں گذر نہیں، ہاں نمود ونمائش سے کوسوں دور ہیں اور اخبارات کی سرخیوں میں
بنے رہیں، اس سے ان کو معمولی درجہ میں بھی دلچسپی نہیں کام کیجئے اور صلہ کی پرواہ مت
کیجئے ان کا مسلک ہے۔ لکھئے کہئے اور پڑھئے ان کا معمول ہے اور یہ معمول گذشتہ ۵۰/
سال سے اس طرح جاری ہے جیسے سورج کے طلوع کا معمول ہے، جس طرح شام کی
آمد لازمی ہے، جس طرح رات کا آنا اور گذرنا ضروری ہے۔

قمر عثمانی دیوبند کی علمی، ادبی، تحریری اور تقریری زندگی کے ایک ایسے ستون
ہیں جس نے آج اس پوری عمارت کا بڑا وزن اٹھایا ہوا ہے، خداوند تعالیٰ نے ان کو ذہن
رسا، سوچ بلند، فکر عمیق، خیال حسین اور پاکیزہ جذبہ عطا کیا ہے سادگی کے ساتھ زندگی
بسر کرنا اور سادگی کے ساتھ ہی دوسروں کے ساتھ پیش آنا ان کا وصف خصوصی ہے، منکسر
المزاج ہیں اور خدا نے ان کو یہ نعمت عطا کی ہے کہ زندگی کے ہر مرحلہ کو وہ آسانی کے
ساتھ گذار لیتے ہیں، اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی امید کا دامن تھامے رکھتے
ہیں، ہر ناگوار بات اور معاملہ سے خوش آئند پہلو کی تلاش ان کا خوب صورت مشغلہ ہے
ہر حال میں صبر اور ہر صورت میں شکر ان کے مزاج کا حصہ ہے نہ خود مایوس ہوتے ہیں
اور نہ دوسروں کو مایوس دیکھ سکتے ہیں ۱۹۵۳ء میں روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے سنڈے ایڈیشن
میں ان کی پہلی غزل شائع ہوئی جس کا مقطع تھا:

کروٹیں لی ہیں زمانے نے ہر گام قمرؔ
اپنا پہلا سا وہی طرزِ بیاں ہے کہ جو تھا

یہ آغاز تھا اور پھر ان کے چھپنے کا سلسلہ جو شروع ہوا تو تھمنے کا نام ہی نہیں آیا،
گذرنے والے کل میں ہفت روزہ ''پیامِ مشرق''، ''بزمِ ہند'' آسنسول (بنگال) نیا دور
لکھنؤ، آج کل دہلی، بیسویں صدی دہلی، رسالہ ''دارالعلوم'' دارالعلوم دیوبند، فکر نو

کراچی مدیر ولی رازی، صاحب زادہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ، دیوبند ٹائمز، ہفت روزہ قومی آواز، روزنامہ الجمعیۃ دہلی، میں وہ شائع ہوتے رہے ان کی غزلیں، نظمیں، نعتیں ان رسائل واخبارات کی زینت بنتی رہیں، آج بھی روزنامہ راشٹریہ سہارا میں وہ اپنی فکری جولانیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں شعر وفکر کے ساتھ ان کی ادبی اور صحافتی تحریریں بھی ملک کے معروف رسائل میں چھپتی رہیں ان کی شعری زندگی جتنی کامیاب ہے، نثری زندگی اتنی ہی قابل رشک ہے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو مجلس اور اردو سروس میں ۱۹۸۱ء سے مسلسل شرکت ہے، دیوبند میں وہ تنہا شخص ہیں، جن کا دونوں جگہوں سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے، بڑی پابندی کے ساتھ پروگرام میں شرکت کرتے ہیں اور بے حد کامیاب ہیں ان کا مجموعۂ کلام "نور ونکہت" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا اور خوشی کی بات ہے کہ دیوبند کے دو نامور ادیبوں جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم اور جناب جمیل مہدی مرحوم نے اس پر اپنی گراں قدر آراء لکھیں یہ بھی قمر عثمانی کے سادہ مزاج ہونے اور زمین سے جڑے رہنے کی علامت ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام پر دیباچہ اور مقدمہ لکھوانے کے لئے ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی "مبارک تذکرے" شخصیات پر لکھے مضامین کا انتخاب ہے، اس کتاب میں قمر صاحب نے اپنے اساتذہ اور دیوبند کے نامور افراد پر لکھے کچھ مضامین کو شائع کیا، "نور ونکہت" اور "مبارک تذکرے" دونوں نایاب ہیں فتاویٰ عالمگیری اور درمختار کی جلد اول کی تسہیل بھی ان کے کاموں کا حصہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں انہوں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں حضرت مدنیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت شیخ الادبؒ، حضرت مولانا سید اختر حسین میاں صاحبؒ، حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ، حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحبؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ کے نام نمایاں ہیں، فراغت کے بعد بھسانی اسلام پور میں درس وتدریس کا آغاز ہوا پھر مدرسہ اسلامیہ اصغریہ دیوبند میں ایک زمانے تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہیں، اب ۸۳ء سے دارالعلوم وقف دیوبند سے وابستہ

ہیں، درس نظامی کی بنیادی اور اہم کتابیں مختصر المعانی، جلالین، مقامات، ہدایہ اولین ا
سے متعلق رہیں اور ہیں گذشتہ ایک سال سے موٴطا امام محمد بھی ان کے زیر درس ہے۔

قمر الزماں قمر عثمانی ۳۰/۳۵/ سال پہلے دیوبند کی ادبی اور شعری نشستوں
اہم حصہ تھے مگر آہستہ آہستہ ان ہنگاموں سے انہوں نے خود کو دور کرلیا، مگر فطرت میں
رچی شعری صلاحیتوں نے ان کا دامن نہیں چھوڑا اب بھی کہتے ہیں اور چھپتے ہیں او
پوری توانائی، پورے وقار، پورے معیار اور پورے اعتبار کے ساتھ شعر کہتے ہیں، ا
کی غزلیں سامع یا قاری کو اردو شعر ادب کی ان لذتوں سے آشنا کرتی ہیں، جہاں
روح کے وجد اور قلب وذہن کی نظافت کا سفر شروع ہوتا ہے، عمر نے ان کی فکر
توانائیوں کو مضمحل نہیں کیا بلکہ تجربے اور مشاہدے کی گہرائی اس مقام پر لے آئی
جہاں وسعتیں بلندیاں اور انفرادیت ہے، اسلوبی شاعری ان کے کلام کی خصوصیت
ہے ان روایتوں کو انہوں نے زندہ رکھا جو اردو شاعری کا امتیاز اور حصہ ہیں ان کی
نعت ہدیۂ قارئین ہے:

تیرے مراتب کا کیا ٹھکانہ کہ تیرا ہمسر کوئی نہیں ہے
نبی بہت سے ہوئے ہیں لیکن کوئی بھی تجھ سا نہیں ہے

تیری محبت مدار ایمان تیرا تصور فروغ ایما
تیری محبت ملی ہو جس کو کوئی پھر اس کو کمی نہیں۔

تجھے بھلا کر زمانے والے اگرچہ مائل بہ ارتقاء ہیں
یہ جہل ہے آگہی نہیں ہے یہ موت ہے زندگی نہیں ہے

یہ صرف تیرا ہی مرتبہ ہے کہ تیری مرضی خدا کا منـ
خدا بھی ناراض ہے اسی میں کہ جسمیں تیری خوشی نہیں۔

تجھے بنایا ہے جس نے رہبر وہ پاگیا دو جہاں کی دولت
تیری تجلی جہاں نہیں ہے وہاں کوئی روشنی نہیں ہے

تری حقیقی بلندیوں کو قمر کوئی کیا سمجھ سکے

جہاں تو پہنچا وہاں سے آگے کوئی بھی منزل رہی نہیں ہے

غزل کے دو نمونے بھی دیکھئے قمر صاحب نے کس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بات کہی ہے ہر شعر میں نغمگی، حقیقت آفرینی اور حالات کی سچائی کا بیان ہے نہ اپنے ماضی سے بے زار ہیں اور نہ دور حاضر کے تقاضوں سے لاعلم ان کی نگاہیں زندگی کے ساتھ رنگ بدلتی اور کروٹ لیتی ان اقدار پر بھی ہیں جنہوں نے انسان کا بھرم کھو دیا ہے اور وہ سکون کی تلاش میں در در بھٹک رہا ہے:

ی کے رُخ پر آثار ندامت دیکھتے رہنا
ت کا اثر اس کی کرامت دیکھتے رہنا

یہ دنیا ہے یہاں حالات یکساں تو نہیں رہتے
تمہیں پیش آئے گی میری ضرورت دیکھتے رہنا

یہ ہے کہ ریاکاری کے جو چولے بدلتا ہے
کہلائے گا پیر طریقت دیکھتے رہنا

میرا دشمن جب اپنی آخری حد پار کر لے گا
وہاں کام آئے گی میری شرافت دیکھتے رہنا

ں کی شمع روشن ہو نظر کا زاویہ بدلے
دوزخ ہو یہ دنیا تو جنت دیکھتے رہنا

یہی شیوہ ہوا کرتا ہے ارباب بصیرت کا
مجازی پیرہن رکھنا حقیقت دیکھتے رہنا

شاید مقدر بن گیا ہے آج انساں کا
ت آنے سے پہلے قیامت دیکھتے رہنا

میں پر سکون سا محسوس ہو رہا ہوں **تمہیں**
ہزار زخموں کا ایک زخم کھائے **بیٹھا ہوں**

نہ جانے کس سے مخاطب ہوں کس کی خوشبو ہے
تصورات کی دنیا سجائے بیٹھا ہوں

میرا کلام میرے تجربوں کا آئینہ
میں حرف وصوت کا جادو جگائے بیٹھا ہوں

تغیرات کی آہٹ پہ کان ہیں میرے
یہی نہیں کہ میں سر کو جھکائے بیٹھا ہوں

وہ بار بار مجھے آزما رہے ہیں قمرؔ
میں بار بار جنہیں آزمائے بیٹھا ہوں

قمرؔ صاحب میرے لئے اس واسطے قابل احترام ہیں کہ وہ ادبی روایتوں کی پاس داری کے ساتھ ساتھ اخلاق وکردار، فکروعمل، صدق ودیانت، علم وفضل، شرافت وانسانیت، لحاظ ومروت، ہمدردی ودردمندی کی روایتوں کو بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں انہوں نے پچھلوں کی سی بے نفسی بے ریائی اور بے غرضی کے چراغ بجھنے نہیں دیئے، جس معیار کا ساتھ اپنا ادبی اور علمی سفر شروع کیا مخالف ہواؤں، ناموافق حالات اور طوفانِ بادوباراں میں بھی اس سفر کا سلسلہ ٹوٹا نہیں وہ بے تکان چلے جارہے ہیں اور اس سے بالکل بے پرواہ ہیں کہ کون ان سے آگے نکل گیا منزلیں ان کے قدم چومنے کے لئے بے چین اور مقصدِ حیات ان کے دامن میں پناہ لینے کے لئے بے تاب ہے آفتاب نصف النہار اور بدر کامل کی تراکیب آپ نے پڑھی ہوں گی، چودھویں کے چاند کا نظارہ بھی آپ نے کیا ہوگا، مگر پورے مہینے بھرپور توانائیوں کے ساتھ چمکنے والے چاند کا منظر آپ نے نہیں دیکھا ہوگا، آسمان علم وادب پر قمر عثمانی ہی وہ قمر آسمانی ہے جو گذشتہ ۵۰/ سال سے چمک رہا ہے اور حقیقت بیں نگاہیں اس سے تسکینِ روح اور تسکینِ قلب کا سامان فراہم کررہی ہیں۔

ایک صاحبِ قلم اور صاحبِ فکر انسان

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی

دنیا میں عمومی طور پر دو طرح کے آدمی پائے جاتے ہیں ایک وہ جو دیکھنے میں بھاری بھرکم، باوقار اور باوزن لگتے ہیں مگر جب ان کو آزمایا اور پرکھا جاتا ہے تو اتنے ہی بودے، کھوکھلے اور بے صلاحیت ثابت ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو شکل سے زندگی میں کچھ بھی کرنے کے اہل نظر نہیں آتے مگر جب ان کے عمل کے دفتر سامنے آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے کا حق ان ہی کا تھا اور سب کچھ صرف انہوں نے ہی کیا۔ اول قسم کے لوگوں کو اگر آپ شہرت اور ناموری کے کاغذی گھوڑے پر سوار دیکھیں تو بغیر کسی پس وپیش کے سمجھ لیجئے کہ خوشامد، چاپلوسی کو ان کی زندگی میں زیادہ دخل ہے اور ہر حربہ انہوں نے دولت سمیٹنے، روپیہ بٹورنے اور شہرتیں ہائی جیک کرنے میں استعمال کیا۔ دوسری قسم کے افراد کا اکثر یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ نہ شہرتوں کو خاطر میں لاتے اور نہ آسائشوں بھری زندگی ان کا مطلوب ہوتی، سیدھی سادی زندگی، نہ زیادہ کی طلب، نہ کم کی شکایت، وہ بھوک سے بلبلا کر نہ اپنے ضمیر کا سودا کرتے اور نہ شکم سیر ہوکر دوسروں کی راہیں کھوٹی کرتے۔ اعلیٰ صلاحیتیں، قابل رشک علم، خداداد ذہانت، اعلیٰ فکری سرمایہ ان کا ہتھیار ہوتے ہیں اور ان کے فکر و عمل کے ترکش کا ہر تیر ان کی مہارت و مشاقی کا منھ بولتا ثبوت ہوتا ہے وہ اپنے اجداد کی روایتوں کو مسجدوں کے حجروں میں بیٹھ کر نہ صرف زندگی بخشتے بلکہ چار چاند لگاتے ہیں وہ دنیا سے بیزار نہیں مگر ان کو دنیا پرست بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس تمہید کے مؤخر الذکر لوگوں میں جس شخص کے خدوخال ابھرتے ہیں وہ

محترم مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی ہیں۔ خاموشی اور یکساں رفتار کے ساتھ کام کرتے رہنا ان کا مشن اور ان کا مقصد زندگی ہے۔ دیوبند کی ادبی، علمی، زندگی کے ہر پڑاؤ پر وہ اپنے وجود کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں۔ ان کے سفر کی ہر منزل ان کی صلاحیتوں کی جولانگاہ ہے۔ دینی مسائل و دلائل کی دنیا سے ان کا رابطہ مستحکم ہے، برسہا برس سے وہ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں جس دنیا سے ان کی وابستگی ہے وہاں انسان صرف اپنے دائروں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور متعین حدود سے باہر نکل کر اس کے لئے کچھ کرنا مشکل ہوتا ہے مگر مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی صاحب کی خصوصیت یہ ہے انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لئے دوسرے میدانوں میں بھی قدم رکھا اور اس کا ثبوت فراہم کیا کہ ان کا انتخاب غلط نہیں تھا ہر جگہ انہوں نے اپنی کامیابیوں کے رنگ بکھیرے ہیں، وہ ادب کی وادیوں میں داخل ہوئے تو اپنا لب و لہجہ اور انداز پیدا کیا، نظم ونثر دونوں میں ان کا رہوار فکر ایک رفتار سے دوڑتا اور ہر منزل پر نشان قدم چھوڑتا ہوا نئے جہان کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے ان کے یہاں جمود اور ٹھہراؤ نہیں حرکت اور عمل کا حسن ہے، حرکت اور عمل کا ثبوت ان کی ظاہری رفتار اور چال سے بھی ملتا ہے، چھوٹی مسجد (نزد چھتہ مسجد) سے نکل کر اگر آپ کسی شخص کو سڑک کے کنارے دائیں بائیں جانب گردن ڈالے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر تیز رفتاری کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھیں تو سمجھ لیجئے یہی مفتی صاحب ہیں، عمومیت کے ساتھ ان کا یہی انداز ہے۔ گھر سے چھوٹی مسجد یا پھر دار العلوم کا دار الافتاء، یکسو، عزلت پسند اور گوشہ گیر قسم کے لوگوں میں سے ہیں، چھوٹی مسجد کا ایک مختصر سا کمرہ ان کے ادبی اور علمی کاموں کا مرکز ہے۔ نیک طبیعت اور سادہ مزاج انسان ہیں۔ ظاہری کروفر سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور نہ مختلف حوالوں سے علمی رعب کا اظہار ان کا مشغلہ ہے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور ہر صنف میں انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ باور کرا دیا ہے کہ جملہ اصناف سخن ان کے لئے آسان اور سہل ہیں، غزل، نظم رباعی، مرثیہ، سلام، نعت، سہرا اور مخمس، کہہ مکرنی وغیرہ عاجز نہیں کہتے ہیں اور خوب

کہتے ہیں اور بقول میرؔ

کیا جانے دل کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے

ان کے اشعار میں ایک رنگ اور کیفیت ہے۔ غالب کی زبان میں دل گداختہ رکھتے ہیں اور فکر و سخن کے تمام تقاضوں نزاکتوں اور باریکیوں پر ان کی نظر ہے۔ غالب شاعری کو قافیہ پیمائی کا نہیں معنیٰ آفرینی کا نام دیتے تھے۔ یہی معنیٰ آفرینی مفتی صاحب کے یہاں بھرپور طریقے پر موجود ہے۔ شعراء کی بھیڑ میں آج جہاں قافیہ پیمائی کے کرتب دکھائے جارہے ہیں چند ہی افراد ہیں جو معنیٰ آفرینی کی دنیا آباد کئے ہوئے ہیں۔

مفتی صاحب کی شاعری انسانی قلب وذہن کو متاثر کرتی اور روح کی گہرائیوں میں اترتی ہے وہ مشاعروں کے شاعر نہیں اس لئے سامعین کے ''بیجا مطالبوں'' کی زد میں نہیں آتے اور اسی بناء پر سطحی شاعری سے ان کا دامن محفوظ رہا ہے ایک ہی غزل کو پورے سال گاتے نظر نہیں پڑتے آج شعراء کا ایک بڑا طبقہ سطحی شاعری کا بوجھ اٹھائے ہوئے دردر بھٹک رہا ہے ایسے میں مفتی صاحب جیسے صاحب فن اور صاحب کمال شخص کا وجود غنیمت ہے ان کی غزلوں میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی حسن بھی ہے اور خوب صورتی بھی، درد بھی ہے اور سوز بھی، پختگی بھی ہے اور نغمگی بھی، سلاست بھی ہے اور روانی بھی، انسانی رشتوں کے کرب، الم اور اضطراب کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جن عناصر سے ان کی شاعری ترتیب پاتی ہے وہ عناصر شعور وفکر، مشاہدے و تجربے اور عصری آگہی سے جلا پارہے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں جگہ وہ موجود ہیں اور ان کی موجودگی سے دیوبند کی علمی، شعری، فکری اور ادبی زندگی کی روایتیں نہ صرف زندہ بلکہ متحرک ہیں۔

مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں اس اعتبار سے انہوں نے دونوں درسگاہوں کے صاحب علم وفضل افراد سے

خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ان کے اساتذہ میں جہاں حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا فخر الدین صاحبؒ، مولانا فخر الحسن صاحبؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحبؒ، مولانا ظہور احمد صاحبؒ، مولانا سید حسن صاحبؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحبؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب مدظلہ، حضرت مولانا سید اختر حسین صاحبؒ، صدر المدرسین حضرت مولانا انظر شاہ صاحب مدظلہ جیسے نامور علماء شامل ہیں، وہیں انہوں نے علیگڈھ کے زمانۂ طالب علمی میں پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب، ڈاکٹر حامد علی خان صاحب، ڈاکٹر مہدی حسن صاحب، پروفیسر غلام مصطفیٰ خان صاحب، پروفیسر عبدالباری صاحب جیسے ممتاز صاحب قلم اور صاحب فکر انسانوں سے استفادہ کیا ہے۔ان کی موجودہ مصروفیت اور کاموں کی رفتار سے بھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام مشاہیر سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت کچھ کرنے پر وہ قادر ہیں زود گو ہیں اور کسی بھی موضوع پر برجستہ، برمحل اور چست اشعار کہہ دینا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ حالات حاضرہ پر بھی ان کی پوری نظر رہتی ہے اور بحیثیت ایک فنکار وہ اس خصوصیت کے مالک ہیں جو ایک فنکار کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔فن کی باریکیوں اور نشیب و فراز سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان کے استعمال کا ملکہ رکھتے ہیں۔ تنگ بندی اور سطحی گفتگو کا ان کے یہاں گذر نہیں، ان کے فکری بلند پروازیوں اور شعری خوبیوں کا ایک بڑا حصہ شائع ہو چکا اور کافی بڑا ذخیرہ ان کی بیاض میں موجود ہے۔ان کے عظیم فکری اور شعری ذخیرے سے چند چیزیں بطور نمونہ پیش کرتا ہوں تاکہ اہل علم اور اہل فکر میرے اس دعوے کے گواہ بن جائیں۔

یہ غلط دل و جاں پر سازشوں کے پہرے ہیں
نت نئی تمناؤں، خواہشوں کے پہرے ہیں

ان کے روئے زیبا پر کس طرح نظر ٹھہرے
کچھ کڑے محافظ ہیں تابشوں کے پہرے ہیں

زندگی کی رعنائی امتحاں کی منزل ہے
ارد گرد راحت ہے لغزشوں کے پہرے ہیں

کیا کرے کوئی شکوہ دل کی نا رسائی کا
حسن کے خیالوں میں دانشوں کے پہرے ہیں

فکر کے اجالے پر ہے نشاط حیرت کیوں
فکروفن کے میداں پر کاوشوں کے پہرے ہیں

چند متفرق اشعار اور دیکھیں:

سمٹے تو گلستاں میں گل تر کی طرح ہے
بکھرے تو وہ خوشبو کے سمندر کی طرح ہے

انگلیاں خوں میں گریبان دریدہ لکھوں
تجھ کو دیکھوں تو نئے رخ سے قصیدہ لکھوں

....

کاسۂ وہم وگماں پر نہ ہو تعمیر غزل
دیدۂ دل پہ جو گذری وہ شنیدہ لکھوں

....

اب کے برس نہ آئے بہاروں کے قافلے
اشجار چپ کھڑے ہیں گنہگار کی طرح

ہر گل کی زندگی ہے حصار ممات میں
دستِ صباء نشاط ہے تلوار کی طرح

نعت گوئی ایک مشکل فن ہے اور یہ مرحلہ طے کرنے والے جانتے ہیں کہ نعت کہنا پل صراط سے گذرنا ہے۔ ایک ایسی پل صراط جو نگاہوں کے سامنے نہیں مگر قلب وذہن کے ہر گوشے میں جس کا احساس جاگتا اور بیدار رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ اردو کے کم وبیش تمام ہی شعراء نے اس صنف میں اپنی عقیدت ومحبت اور فکروہوشیاری کے دیے جلائے ہیں مگر امیر مینائی، علامہ اقبال، مولانا حالی، بہزاد لکھنوی، محسن کاکوری

اور زائرِ حرم حمید صدیقی کے سوا کسی بھی شاعر نے مستقل طور پر اور مسلسل اس صنف کو اختیار نہیں کیا۔ کفیل الرحمٰن نشاط صاحب نے نعت کہہ کر اپنا نام انہیں سعید اور نیک بخت انسانوں کی فہرست میں درج کرایا ہے۔ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیں کہیں اور ایمان وعقیدے کی پوری سلامتی کے ساتھ اس پل صراط سے آسانی کے ساتھ گذر گئے ان کی نعتوں کا ایک مجموعہ ''نعت حضورؐ'' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے اس مجموعہ سے منتخب یہ نعت دیکھئے۔

کبھی لب پہ ذکرِ حرم رہے، کبھی لب پہ ذکرِ نبی رہے
مری زندگی میں بفضلِ رب یوں ہی شمعِ نور جلی رہے

مری آرزو کے چراغ کو جو ملے قبول کی روشنی
نہ خیالِ صبحِ سکوں رہے نہ ملالِ تیرہ شبی رہے

مجھے اپنے آپ پہ ناز ہو مرا سر خوشی سے فراز ہو
جو حرم کی پاک زمین پر مرے آنسوؤں کی نمی رہے

مٹیں دل کی کہنہ اداسیاں جو ہوں آگے روضے کی جالیاں
کبھی عشق آنکھوں سے ہو عیاں کبھی آگ دل میں دبی رہے

کہیں لطفِ خاص کی بارشیں کہیں سب پہ عام نوازشیں
کہیں رحمتوں کے ہجوم میں طلب شکستہ دلی رہے

کبھی شہرِ طیبہ کا دید کی ملے اذن یوں بھی نشاطؔ کو
یہ غلامِ شاہِ حجاز ہے اسے اذن راہ روی رہے

تقریباً چالیس سال سے وہ علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اس سمت میں ان کا سفر صلہ اور ستائش کی کسی تمنا اور ایوارڈ وانعام کی کسی طلب کے بغیر جاری ہے۔ لگ بھگ پچاس کے قریب شروح وتراجم، تالیفات وتصنیفات ان کے قلم کی مرہونِ منت ہیں جن میں تفہیم المسلم شرح مسلم، ترجمہ شمائل ترمذی، ترجمہ فتاویٰ عالمگیری، سراج

الوقایہ شرح اردو شرح وقایہ، سراج النحو شرح ہدایت النحو، اصول اکبری شرح فصول اکبری وغیرہ شروح و تراجم معروف ہیں، تالیفات میں زیارت قبور، بدعت اور شرک، حیات ابوذرؓ، حیات ابن عباسؓ، حیات سلمان فارسیؓ، حیات ابوہریرہؓ، کے نام نمایاں ہیں۔ مفتی صاحب جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس کی علمی تاریخ ایک صدی سے زائد زمانہ کا احاطہ کرتی ہے ان کے آباء واجداد میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ عثمانی جیسی برگزیدہ اور مشہور عالم شخصیات شامل ہیں ان کے والد قاری جلیل الرحمٰن صاحب عثمانی خاندان کے وہ ممتاز فرد تھے جنہوں نے علمی نسبتوں اور خاندانی روایتوں کی پوری پاسداری کی اور اولاد کی تعلیم وتربیت میں پوری مشاقی اور محنت کا ثبوت دیا خدا کرے مفتی صاحب فکروادب اور تحریر وقلم کی دنیا سے اسی طرح وابستہ رہیں اور ان کے قابل قدر کارنامے اسی انداز پر سامنے آتے رہیں۔

میں یہ بات پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مفتی صاحب ایک لمبے وقت سے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں، ان کے لکھے فتاویٰ پر اعتبار کیا جاتا اور اہل علم کے یہاں وقیع انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کا اردو ترجمہ ان کی علمی اور فقہی صلاحیتوں اور درک کا معیار قائم کرتا ہے۔ مفتی صاحب نے اس قدیم ذخیرے کو اردو قالب میں ڈھالنے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور اہل علم کا خاصہ بھی۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو مفتی صاحب مختلف سمتوں میں بنیادی اور تعمیری کام کر رہے ہیں۔

❁ ❁ ❁

تاجدارِ شعر وادب

علّامہ انور صابریؒ

وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے، اور اس کی تیز رفتاری بہت سے ان حقائق کو سیلِ رواں کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے جارہی ہے جو کبھی مجسم صورت میں ہمارے سامنے تھے اور جن کے وجود کی خوشبو سے یہ کائنات مہکتی تھی۔

ہر شعبۂ زندگی میں یہ عمل کارفرما ہے نہ معلوم کتنے چھوٹے بڑے واقعات وقت کی دہلیز پر دم توڑ چکے ہیں اور کتنے افراد ہیں زمانے کی برق رفتاری نے جن کے چہروں کی چمک چھین لی ہے اردو شاعری کے وجود کو جن شعراء نے آب وتاب بخشی اور جس کی صورت کو اربابِ کمال نے حیاء اور حسن عطا کیا ان میں بہت سے زندگی کے جھمیلوں سے دامن چھڑا کر موت کی وادیوں میں اپنا ٹھکانا بنا چکے ہیں مگر ان کے فکر اور فن کی قندیلیں آسمان شاعری پر اس طرح روشن ہیں کہ سورج کی تمازت، چاند کی چاندنی، ستاروں کی چمک کے بیچ وہ اپنی موجودگی کا احساس دلارہی ہیں اور جب تک شاعری کا یہ ہفت رنگ آسمان سجا ہوا ہے اس وقت تک ان کی شاعری کے غنچے بھی مہکتے اور چٹکتے رہیں گے۔

دیوبند جیسی مردم خیز بستی میں ایک ایسے شاعر کا جنم ہوا جس نے ۵۰ ربرس تک اپنے لحن داؤدی اور منفرد شاعرانہ کمالات سے ایوانِ شاعری میں غلغلہ برپا کیے رکھا، جس کی موجودگی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت اور جس کی ذہانت فطانت، بذلہ سنجی، شاعرانہ مجلسوں کا وقار تھی، علامہ انور صابری مرحوم کی شاعری ایک ایسی جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ وقت کے تیکھے تیور، حالات کی بڑھتی ہوئی کشمکش اور بدلتی اقدار

اس پر اثر انداز نہیں ہوئیں، وہ کل بھی رفیق جاں تھی آج بھی مونس غم ہے اور آنے والے کل میں بھی مسیحائے فکر بنی رہے گی، زود گوئی ان کا ملکۂ خاص تھا اور دوشیزۂ فکر کی زلفیں سنوارنا ان کا امتیاز، وہ شعراء کی اس پیڑھی کے نمائندے تھے، جنہوں نے ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھا تھا، آزادی کا سورج ان کی آنکھوں کے سامنے طلوع ہوا اور پھر بھیانک فسادات اور تقسیم کا زہر انہیں پینا پڑا اس طرح ان کی شاعری انقلاب کی نقیب بنی آزادی کی چاشنی اور درد وغم کے سانچے میں ڈھل کر ایک نئے آہنگ اور ایک نئی حقیقت نے وہ فن پارے تخلیق کئے جن کو بلا تأمل ادبی سرمائے میں اہم اضافوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔

وہ فقیر منش انسان تھے، لا اُبالی اور بے فکر طبیعت کی بناء پر حالات کو اپنی مرضی کے تحت گزارنے کے عادی تھے، حالات اور مسائل ان پر سوار ہوئے ہوں ایسا کبھی نہیں ہوا، حالات کو اپنے حق میں موڑ لینا اور حاوی ہو جانا ان کا وصف خاص تھا سیاسی اسٹیج سے لے کر جب انہوں نے آزادی کے نغمے گائے مذہبی اجتماعات تک جب مختلف دینی تحریکوں کا وہ حصہ رہے ان کی شاعری کا سورج سوا نیزے پر ہی رہا، مجلس احرار کی تحریکات ہوں یا خلافت کی جدوجہد کا زمانہ ان کی انقلاب آفریں آواز نمایاں رہی ہر مکتب فکر کے زعماء کے یہاں ان کا مقام تھا، سیاست کے میدانِ خارزار میں بھی ان کا سکہ چلا، مذہبی حلقوں میں بھی وہ چمکے ور ادبی مجلسوں میں بھی ان کی حکمرانی قائم رہی یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ مرحوم کی صورت میں دیوبند کی شعری میدان میں جو ترجمان ملا وہ میدان کل بھی خالی تھا آج بھی وہاں خاک اڑتی ہے اور آنے والے کل میں بھی اس کا سناٹا کم نہیں ہوگا، ان سے قبل دیوبند کی شاعری اپنا ایک مخصوص انداز رکھتی تھی اس کو بلند پرواز، نکھری سوچ اور سوز دروں علامہ ہی نے بخشا۔

دیوبند کی شاعری کی ابتدا صحیح معنی میں حضرت حبیب حسن وحشی سے ہوتی

ہے جو ۱۸۴۰ء میں دیو بند میں پیدا ہوئے فلسفہ، شعر ادب کے امام تھے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کو بھی بعض غزلوں پر اصلاح دی ۱۸ دیوان ترتیب دیئے مگر دست برد زمانہ سے کوئی محفوظ نہ رہ سکا پرانے رسالوں اور قدیم ادبی پرچوں میں بسیار محنت کے بعد ایک دو غزلیں ہی ہاتھ لگ سکی ہیں شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی ان کے خصوصی اور ارشد شاگرد تھے حسرت وحشی کے چند شعر بطور تبرک پیش ہیں۔

تیری لکنت پر فدا سو جان سے دل ہوگیا
تو نے آدھی بات کی میں نیم بسمل ہوگیا

دن چھپے آئی تھی دن نکلے گئی آئے نہ تم
اب اٹھا کر لے گئی ہے اپنا بستر چاندنی

دل شکستہ ہوں سہی لیکن نہیں ہوں اس قدر
مے مرے حصہ میں ایک ٹوٹے ہوئے ساغر میں ہے

فکرِ فردا حال۔ کے زہراب کو پینے نہ دے
گردشِ دوراں دل کے زخم کو سینے نہ دے

اے شعور آگہی تو ہی بتا میں کیا کروں
موت جب جینے نہ دے اور زندگی مرنے نہ دے

زود گوئی اکثر اوقات آورد کا شکار ہو جاتی ہے اور جس کے ساتھ فی البدیہہ کی خصوصیت بھی ہو تب تو آورد سے دامن بچا کر نکل جانا ناممکن ہے مگر علامہ کا مکمل کلام آمد کا حسین شاہکار ہے بھرتی کی کوئی چیز اگر ملتی بھی ہے تو اتنے بڑے شعری ذخیرے میں اس کا ذکر بے معنی ہے وہ کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، کلام کی کثرت نے بھی کبھی شعری محاسن پر آنچ نہ آنے دی، قسام ازل نے ان کو ذہن رسا، فکر بلند، نگاہ عمیق عطا فرمائی تھی مشاہدہ اور تجربہ کی دھیمی آنچ نے ان کے فن کو گہرائی و گیرائی، نزاکت و وسعت، پختگی و بے ساختگی، برجستگی اور بیتابی کی دولت بخشی تھی، ان کی شعری

خدمات اس قدر ہیں کہ سب کو یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں مگر اپنی زندگی کے مخصوص طریق کی طرح ان کا کلام بھی اتنا محفوظ نہیں ہے جتنا ہونا چاہئے تھا وہ اپنی شخصیت کو جس سانچے میں ڈھالے ہوئے تھے اس میں کوئی بناوٹ تصنع اور دکھاوے کی آمیزش نہیں تھی، وہ سادگی جو فطرت میں رچی بسی تھی وہی سادگی ظاہر میں بھی ہر وقت ان کے ساتھ لگی رہتی بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک اسی شانِ بے نیازی اور محبت وشفقت کے ساتھ ملتے اور کسی کو ان کے عمل سے یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک عظیم شاعر سے مل رہے ہیں دل میں ان کی عظمت ضرور قائم رہتی۔

وقت کی نامور شخصیتوں سے ان کے تعلقات تھے، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اندرا گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، حافظ ابراہیم، اجیت پرساد جین وغیرہ کے علاوہ سیاسی دنیا کی اکثر قدآور شخصیتوں سے ان کے مراسم تھے، سب ان کی ادبی شخصیت کو تسلیم کرتے اور ہر ایک ان کی دلجوئی کرتا شعراء وادباء میں ان کے تعلق والوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا حضرت جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، مولانا ماہر القادری، پنڈت ہری چند اختر، شوکت تھانوی، ادیب سہارنپوری، نذیر بنارسی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، روش صدیقی جیسے شعرائے وقت ان کے حلقۂ احباب میں تھے اور کچھ ان کے بزرگوں میں شمار کئے جاتے تھے صابری مرحوم نے گلشن شاعری کی آبیاری، جس شگفتگی اور جس شیفتگی اور والہانہ انداز میں کی وہ بہت کم لوگوں کا حصہ بنتی ہے وہ ہندوپاک ہی نہیں بلکہ برصغیر کے ان چوٹی کے شعراء میں سے تھے جن کے دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ کائنات شاعری کی نبضیں چلتی ہیں اور جب وہ ٹھہرتے ہیں تو پوری ایک دنیا ویرانی کا شکار نظر آتی ہے۔

علامہ انور صابری اس کائنات کے ایک ایسے فرد تھے شعروسخن جن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا وہ فطری شاعر تھے کسی حادثہ یا کسی خاص واقعہ نے ان کو شعروادب کی

جانب مائل نہیں کیا تھا اس کے لئے ان کی شاعری میں قافیہ پیمائی کی کوشش دکھائی نہیں دیتی ان کے یہاں تاثیر بھی ہے اور خوبصورتی بھی، وسعت بھی ہے اور بلند فکر بھی، جذبات بھی ہیں اور حقیقت نگاری بھی آفاقیت بھی ہے اور صداقت بھی حالات کا بیان بھی ہے اور واقعات کی سچائی بھی شعر و سخن کی ایک ایسی قوت ان کے یہاں موجود ہے جو ان کو ممتاز کرتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ پچھلوں کی چابکدستیوں کو انہوں نے خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اختیار کیا تھا، قدیم و جدید شعراء کے کلام پر ان کی نظر تھی اور وقت کے تقاضوں کو وہ سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری گئے وقتوں کی کہانی نہیں بلکہ موجودہ حالات کی عکاس ہے، جیسا کہ میں نے اس سے قبل ذکر کیا صابری صاحب کے شعر و سخن کا سرمایہ بے انتہا ہے اور اس کا ایک مختصر مضمون میں احاطہ کرنا ناممکن ہے ہاں ان کے ایک ایسے منفرد کارنامے کا ذکر ضرور کروں گا جو منفرد بھی ہے اور ناقابل فراموش بھی اور ہماری اردو شاعری کی تاریخ کے گزشتہ ۴۰ ر ۵۰ برس اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

"ساقی نامہ" ان کی ایسی ۶۰ ر مرصع غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں ساقی کے ہر روپ کی جلوہ گری ہے پھر یہ ۶۰ ر غزلیں صرف ایک ہفتہ کی شاعرانہ کاوش کا شاہکار ہیں ۱۵ ر جون ۱۹۵۱ء سے اس ساقی نامہ کا آغاز ہوا اور ۲۳ ر جون ۱۹۵۱ کو پایۂ تکمیل کو پہنچا پورے مجموعہ میں ۳ غزلیں ایسی ہیں جو ۴۲ء اور ۴۸ء میں کہی گئیں، صابری صاحب کا صرف یہ عظیم کارنامہ ہی اگر سامنے آیا ہوتا تو شاعری کی دنیا میں ان کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی تھا آیئے اس "ساقی نامہ" کی جلوہ گری دیکھیں کہ صابری صاحب نے اس کو کتنے روپ بخشے ہیں۔

تری نگاہ خاص کا ممنون
مے خانہ بردوش ہے ساقی

وعظ میں بہکی بہکی باتیں
کیا واعظ بے نوش ہے ساقی

فسردہ کلیاں، اداس غنچے، گلوں کے چہروں کا رنگ پھیکا
ضرور گزری ہے گلستاں پر کوئی نئی واردات ساقی
ذرا پڑھ کر تو دیکھ اپنے وفاداروں کے افسانے
سر فہرست انور صابری کانام ہے ساقی

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ساقی نامہ پر بڑا مکمل، مبسوط اور جامع دیباچہ لکھا ہے، ان غزلوں کے بارے میں حرفِ آخر کے طور پر ان کی یہ چند سطور لائق مطالعہ ہیں کہ:

''ان غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے ہر غزل ایک علیحدہ فضا رکھتی ہے جس میں بڑا تنوع اور رنگارنگ کیفیات ہیں ان میں روحِ عصر بھی ہے اور وہ اجزاء بھی جنہیں ہم ماورائے عصر کہہ سکتے ہیں جن کا تعلق انسان کی بنیادی اقدار اور اس کے روحانی اکتسابات سے ہے''۔

صابری صاحب کو نظم کی طرح نثر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی ان کے کافی مضامین مختلف عنوانات پر ملتے ہیں، نثر میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقلد تھے ان کے ایک مضمون کا اقتباس دیکھئے:

''تمدن کے چراغوں کو روشن کرنے کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے والے دماغ، فروغِ انسانیت کی تدابیر سوچنے والی طبیعتیں اور زندگی کو دولتِ دوام بخشنے کی جدوجہد کرنے والے ذہن، تعصب وعناد، بغض اور آپس کی عداوتوں میں پھنس کر وہ سب کچھ کر جاتے ہیں جسے وقت کا مؤرخ شاملِ تاریخ کرتے ہوئے بے حد تکلیف محسوس کرتا ہے''۔

ایسے ہی ان کی کتاب ''وہ جنہیں کوئی نہیں جانتا'' شگفتہ اور نکھری ہوئی نثر کا عملی نمونہ ہے، اس کتاب میں صابری صاحب نے ان غیر معروف اور گمنام شاعروں کا

تذکرہ کیا ہے۔ جن تک ادبی حلقوں کا رسائی مشکل سے ہو پاتی ہے دوسرے ان کی ایک اور کتاب "برے دور کے اچھے لوگ" بھی ان کی نثری صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آئے جن میں نبضِ دوراں، ملاقات اولیاء، آزادی کے ہیرو، دکھی کلکتہ، مجیٹھیہ سرداروں کی کہانی، سلام علیک، مدینہ سے اجمیر تک وغیرہ شامل ہیں "بزرگوں کی کہانیاں" کے عنوان سے بھی ان کا مسلسل نظموں کا سلسلہ کئی سال تک ایک مقامی رسالہ "ہادی" میں چلا جو ہنوز طباعت کے مرحلہ میں داخل ہونے کا منتظر ہے صابری صاحب زمین کے باسی تھی اور زمین پر رہنے والے انسانوں کے مسائل کو انہوں نے اپنی شاعری کا مرکز بنایا ان کی سیاسی نظموں کا مجموعہ "بہادر شاہ سے جواہر لال نہرو تک" جو ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا میرے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

صابری صاحب نے نعتیں بھی خوب کہیں ان کی نعتوں کا بہت بڑا حصہ چھپ چکا ہے اگر ان تمام نعتوں کو جمع کیا جائے تو ایک لائق مطالعہ کتاب سامنے آجائے عشق نبی میں ڈوب کر اور عشق رسول میں تڑپ کر جو انہوں نے کہا اس سے ان کی محبت، عقیدت اور والہانہ تعلق کا ہی اظہار نہیں ہوتا بلکہ سیرت نبی کریم پر واقفیت، تاریخی حقائق پر نظر اور اسلامی واقعات اور صداقتوں پر بھی ان کے باخبر ہونے کا احساس ہوتا ہے، یہ نعت ان کے قابو یافتہ ہونے اور اس میدان میں بھی کامل ہونے کا اچھا نمونہ ہے۔

سیرتِ یزداں، صورتِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
حسنِ مکمل، عشقِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

شمع فروزاں محفل کل میں، مہر منور بزم رسل میں
جسم موخر، روح مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

شاہِ مدینہ، مالکِ بطحا نازشِ دنیا، زینتِ عقبیٰ
کون ومکاں کے صدر مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ذکر مقدس ارفع واعلیٰ، نام مبارک اطہر وبالا
ذاتِ گرامی افخر واعظم صلی اللہ علیہ وسلم

جنبشِ لب فرمانِ کرم ہے، لوحِ جبیں عنوان کرم ہے
عقدہ کشائے مشکل عالم صلی اللہ علیہ وسلم

ساقیٔ کوثر، چشمۂ فیضان، ابر نوازش لطف بداماں
رحمتِ حق کی بارش پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

ہے تجھے حاصل جنکی غلامی حشر میں ہونگے جب وہی حامی
انورؔ غم گیں پھر تجھے کیا غم صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ انور صابری عمر بھر اپنے شعری وفکری چراغوں کو روشن کرتے رہے اور ان چراغوں کی روشنی سے آج بھی اس راہ پر چلنے والے راستہ پا رہے ہیں انہوں نے مرض والوفات سے چند دن پہلے کہا تھا کہ:

آج تم برہم تو ہو۔۔ ہو مری آواز سے
عمر بھر ترسا کروگے پھر اسی آواز کو

اس وقت کا یہ شعر بھی ہے کہ:۔

عمر بھر اب زباں نہ کھولیں گے
تم پکارو گے ہم نہ بولیں گے

۱۳/اگست ۱۹۸۳ء کو حقیقتاً یہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی اور ایک ایسا اداس ماحول بنا گئی کہ اس کی اداسی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ جو مجلسیں ان کے دم سے آباد تھیں اور جو مشاعرے ان کے نام سے رونق پاتے تھے، وہ ماضی کا حصہ بن چکے۔ اب چاروں طرف پرہول سناٹا ہے ایسا سناٹا جہاں صابری صاحب کے بعد روشنی کی کوئی کرن نہیں، زندگی کی کوئی رمق نہیں اور ظرافت وبذلہ سنجی کا کوئی احساس نہیں، دیوبند اپنے ترجمان کے گم ہونے پر دکھی اور کسی دوسرے چہرے کی تلاش میں

سرگرداں ہے مگر عمر فاروق عاصمؔ، مولانا قمر عثمانی، مولانا کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی، عبداللہ راہی وغیرہ کے خود کو سمیٹ لینے اور محدود کرلینے اور تاجدارتاجؔ کے ترکِ سکونت کے بعد صرف نوازؔ دیوبندی یا ماجد دیوبندی، ماجد دیوبندی یا نواز دیوبندی مشاعروں کی رونق ہیں اور دیوبند کے سلسلۂ شاعری کو زندہ رکھے ہوئے ہیں مگر ان کے لئے اسٹیج اور پیشہ کی مجبوریاں کسی فن پارے کی تخلیق میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں کاش ان کے ذریعہ کوئی ایسا معجزہ ہوجائے کہ انور صابری کی شاعرانہ عظمتوں کا تناور درخت ہمیشہ بہار دیتا رہے۔

❁ ❁ ❁

شعر وادب کی ایک نمائندہ شخصیت

حفیظ میرٹھی

اردو شعراء کی وہ پیڑھی جس نے شرافت وانسانیت کو زندگی کے آخر لمحوں تک سینے سے لگائے رکھا وہ دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی ہے وہ نقوش دھندلے ہو رہے ہیں جن سے حیاتِ مستعار کے چمن میں مہک تھی، خوشبو تھی، دلآویزی تھی اردو یوں بھی محرومیوں کے ماحول میں سسک رہی اور جی رہی ہے ایسے میں اس کا کوئی سچا عاشق اور عظیم فنکار رخصت ہوتا ہے تو یہ قیامت کا وقت ہوتا ہے۔

حضرت حفیظ میرٹھیؒ اپنی شرافت، دیانت، عظمت، خودداری تمام اوصاف کے ساتھ مالک حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے برکتوں کے مہینے اور سعادتوں سے پر لمحوں میں انہوں نے تحفۂ جسم وجاں ہی اپنے رب کو پیش کر دیا ان کے کمالات، شاعرانہ خصوصیات اور آدمیت کے تذکرے دیر تک جاری رہیں گے، اور وقت کی غیر محسوس رفتار کے ساتھ ان کی بلند خدمات کو بھلانا ممکن نہ ہوگا وہ نقاد جنہوں نے حفیظ کے فن اور فکر کو نظر انداز کیا وہ بھی جلد یا بدیر اس کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور ان کی شاعرانہ عظمتوں سے نظریں چرا کر ان کے لئے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوگا حفیظ صاحب جس صف کے آدمی تھے اور قدرت نے جو مزاج اور طبیعت ان کو بخشی تھی اس کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ نقاد ان کی طرف متوجہ ہوں یہاں تو شور مچانے والے اور میڈیا کے کاندھوں پر سوار ہو کر سفر طے کرنے والوں کی پذیرائی ہے خاموشی اور دردمندی کے ساتھ کام کرنے والوں کو کب قابلِ توجہ سمجھا گیا ہے موجودہ دور صرف انہی فنکاروں کے زندہ رہنے کا ہے جو ذرائع

ابلاغ کے (کارآمد) استعمال پر واقف ہیں پھر جس شخص نے اپنی زندگی میں ان سب جھمیلوں اور تکلفات کو اختیار نہ کیا ہو مرنے کے بعد بھلا اس کو ان سب چیزوں کی کیا پرواہ اچھا ہوا حفیظ صاحب نے بساطِ حیات ہی سمیٹ لی۔

حفیظ صاحب تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور تھے جتنا صاف لباس اور سادہ پوشاک زیب تن کرتے تھے اتنے ہی وہ صاف باطن اور صاف دل انسان تھے طبقۂ شعراء میں ان کا وجود فرشتہ کی مانند تھا جو زمین پر بسنے والے انسانوں کے لب ولہجہ اور زبان میں گفتگو بھی کرتا تھا، ان کے دکھ، درد اور مسائل کو سمجھتا بھی تھا مگر جس کی فطرت فرشتوں کی سی تھی اور وہ تمام عمر فرشتوں ہی کی طرح انسانوں کے درمیان رہے ان کے چلے جانے سے محرومی اور مایوسی کے اندھیرے اور بڑھے ہیں ان اندھیروں کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے کہ حفیظ صاحب کے شایانِ شان خراج عقیدت پیش کیا جائے اور ان کی گرانقدر خدمات کو سامنے لایا جائے۔

حفیظ صاحب کے بارے میں یہ بات لکھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اچھے شاعر تھے یا اچھے انسان وہ قابل رشک آدمی بھی تھے اور قابل فخر شاعر بھی انکی زندگی کی گہری چھاپ ان کی شاعری پر تھی وہ جیسے تھے اس سے اچھی شاعری کرتے تھے اور جتنی اچھی شاعری کرتے تھے اس سے زیادہ اچھے انسان تھے، شاعری کے میدان میں ان کی حیثیت مسلم تھی جتنا کچھ انہوں نے کہا وہ اعلی درجہ کے ادب کا ایک حصہ ہے ان کی شاعری درد، کسک، اضطراب، تلخی، سچائی، بیباکی، جرأت، خود داری اور انقلاب کا مکمل عنوان تھی غیور طبیعت انسان تھے شاعری میں بھی وہ رنگ غالب تھا کسی بھی فنکار کے لئے ایسا کرنا بہت مشکل ہے کہ جو پیغام وہ لوگوں تک پہنچائے اس پیغام کی وہ خود بھی عملی تصویر ہو، ہم ایسے باکمال لوگوں کو اپنے قریب پاتے ہیں جن کے قول وفعل میں زمین وآسمان کا تضاد ہے ان کی تحریریں، تقریریں اور شاعری سے ان کی زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

حفیظ حقیقی بات یہ ہے کہ اس دور کے انسان ہی نہیں لگتے تھے بھلا وہ شخص جو اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیتوں، اخلاق اور فکر کا مالک ہو اور پھر اتنی بے اعتنائی، استغناء کے ساتھ جیتا ہو وہ کیسے اس زمانے کا آدمی ہو سکتا ہے وہ کتنے سچے فنکار اور اعلیٰ کردار انسان تھے اس کا احقر کو ذاتی طور پر تجربہ ہے ۱۹۸۵ء میں راقم کے والد مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے ان کی یاد میں ایک تعزیتی نشست اسلامیہ انٹر کالج دیو بند میں منعقد ہوئی مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی شعراء میں حضرت حفیظ مرحوم مہمان خصوصی کی حیثیت سے دیو بند تشریف لائے تھے سچ تو یہ ہے کہ حفیظ صاحب کی شرکت سے یہ نشست ایک کامیاب مشاعرہ میں تبدیل ہو گئی رات کے دو بجے تک کامیابی کے ساتھ پروگرام چلا حفیظ صاحب نے پورے جوش اور جذبے کے ساتھ ۵،۶ غزلیں سنائیں جس کو بھرپور انداز میں وہ لہک لہک کر پڑھ رہے تھے پورا مجمع مسحور تھا ان کی معرکۃ الآراء غزلوں اور لحن داؤدی سے پورا ہال گونج رہا تھا خاص طور پر جب انہوں نے اپنی مشہور غزل کا آغاز کیا اور یہ شعر پڑھے:

زنجیریں تو ہٹ جائیں گی پر ان کے نشاں رہ جائیں گے
میرا کیا ہے ظالم تجھ کو بدنام کریں گی زنجیریں

اندھوں بہروں کی نگری میں یوں کون توجہ کرتا ہے
ماحول سنے گا، دیکھے گا جس وقت بجیں گی زنجیریں

تو ایسا لگا کہ آج حفیظ صاحب شاعری کی معراج پا چکے ہیں نشست ختم ہو گئی تو حفیظ صاحب برادرم عبداللہ راہی کے یہاں تشریف لے گئے میرے لئے صبح کو ایک مشکل مرحلہ یہ سامنے پیش آیا کہ حفیظ صاحب کو کیا پیش کیا جائے طے پایا ۲۵۰/روپے بند لفافے میں ان کی خدمت میں پیش ہوں وہ رکشہ میں سوار ہو کر روانہ ہو چکے تھے میں دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا رکشہ رکوایا اور بند لفافہ ان کی طرف بڑھایا لفافہ ہاتھ میں لینے سے پہلے حفیظ صاحب نے پوچھا اس میں کیا ہے

اتنا پوچھنا تھا کہ میں سہم گیا کہوں تو کیا کہوں ۲۵۰/روپے وہ بھی حفیظ جیسے بلند مرتبہ شاعر کے لئے خاموش کھڑا رہا دوبارہ پوچھنے پر بڑی ہمت کر کے عرض کیا اتنے روپے ہیں حفیظ صاحب نے اسی خندہ پیشانی، شگفتہ مزاجی کے ساتھ فرمایا صرف صرف ۲۵/روپے عنایت فرما دیجئے باقی رکھ لیجئے اتنے روپے میرے کرائے کے لئے کافی ہیں اور یہ روپے بھی میں تبرک کے طور پر لے رہا ہوں اللہ اللہ یہ آدمی تھا یا فرشتہ وہ آدمی ہی تھے فرشتہ نہیں مگر آدمیت کا سارا حسن ان کی ذات میں سمٹ آیا تھا۔

یہ میری زندہ اور چلتے پھرتے حفیظ سے پہلی ملاقات تھی اس سے پہلے ان کو پڑھا تو تھا سنا نہیں تھا سننے کے بعد احساس ہوا کہ وہ واقعی باکمال ہیں ان کی شاعری کا ہر رنگ ان کے وجود کا حصہ ہے وہ اس دکھ اور درد کو قریب سے محسوس کرتے تھے جو آج کی انسانیت کا المیہ ہے وہ امیر اور غریب کے بیچ کی اس دیوار کو منہدم کرنا چاہتے تھے جس نے بھوک، مفلسی اور تنگی کے سائے اور بڑھا دیئے ہین وہ انقلاب کے نقیب اور سماجی برابری کے علم بردار تھے وہ محبتوں کے پیامی اور ظالم کے دشمن تھے قدرت نے ان کو حساس دل عطا کیا تھا اسی حساس دل کی آواز ان کی شاعری ہے ان کی شاعری میں اضطراب ہے، بے چینی ہے، کرب ہے اور ایک ایسی تڑپ ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے انکی خودداری نے کہیں ان کو جھکنے نہیں دیا وہ شان کے ساتھ جئے، سر اٹھا کر سفر حیات طے کرتے رہے اور نیکیوں کے موسم بہار میں اپنے مالک سے جا ملے بہت پہلے انہوں نے کہا تھا:

کیسی بھی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے

حقیقت میں انہوں نے مشکلات کا، مصائب کا پامردی سے مقابلہ کیا اور کبھی ان کی پیشانی پر فکر و تردد کی کوئی لکیر نظر نہیں آئی اپنی کسی ضرورت کا انہوں نے

کبھی کسی سے اظہار نہیں کیا مسکراتے ہوئے زندگی گذاری اور مسکراتے ہوئے رخصت ہو گئے ان کی موت ایک بڑا ادبی سانحہ ہے ان ہی کا ایک معروف اور زبان زد شعر ہے:

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

حفیظ صاحب کی موت واقعی دلوں کا ٹوٹنا ہے مگر اس موت پر ادبی دنیا خاموش نہیں رہے گی ان کی جدائی کا غم وقت کے ساتھ گہرا ہوگا ان کی یادوں کی کسک دیر تک تڑپائے گی اور ان کی ادبی خدمات کا مدتوں تذکرہ ہوگا۔

۞ ۞ ۞

علم وادب اور فکر وخیال کا حسین سنگم

مولانا عامر عثمانی مرحوم

۱۹۷۳ء کا سال میرے قلمی اور تحریری سفر کا آغاز تھا اور ٹھیک اسی زمانہ میں مولانا عامر عثمانیؒ کی ادبی، صحافتی، زندگی کا سورج نصف النہار پر تھا ماہنامہ ''تجلی'' اردو کے ان پرچوں میں شمار کیا جاتا تھا کہ جس کو وہ طبقہ بھی پڑھنے پر مجبور رہتا تھا جو عامر صاحب کی سوچ اور فکر سے متفق نہیں تھا، ماہنامہ ''تجلی'' ان رسالوں میں تھا جن کو ہم اپنے بچپن سے پڑھتے چلے آئے تھے زکریا اسعدی مرحوم کا ہفت روزہ ''بیباک'' سہارنپور، مفتی شوکت علی فہمی کا رسالہ ''دین دنیا'' دہلی مستحسن فاروقی کا ''آستانہ'' اور ''پیام مشرق دہلی'' پھلواری شریف پٹنہ سے نکلنے والا پرچہ ہفت روزہ ''نقیب'' ماہنامہ ''دارالعلوم'' ان بے شمار اخبارات ورسائل میں سے چند تھے جن کو ہم ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ''تجلی'' کے وہ چند صفحات ہماری دلچسپی کا مرکز تھے جو ملا ابن العرب مکی کے قلمی نام سے ''مسجد سے میخانے تک'' کے عنوان کے تحت مولانا عامر عثمانیؒ کے قلم سے نکلتے تھے ناسمجھی اور بے شعوری کا دور ہونے کے باوجود اس کالم میں ایک مقناطیسی کشش تھی کہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود صفحات کے صفحات پڑھتے چلے جاتے اور اس بے شعوری کے دور میں شعور کی کوئی لہر آتی تو بے ساختہ قہقہہ بلند ہو جاتا بات کبھی سمجھ میں آتی اور کبھی سروں پر سے گزر جاتی مگر طنز ومزاح سے بھرپور یہ کالم عامر صاحب مرحوم کی تحریری اور قلمی بلندیوں اور عظمتوں کا گواہ تھا۔

مولانا امین الرحمٰن عامر عثمانی کا تعلق ایک باوقار علمی خاندان سے تھا امین

الرحمٰن ان کا اصلی نام تھا اور عامر عثمانی انہوں نے قلمی نام کے طور پر اختیار کیا تھا امین الرحمٰن کو کوئی نہ جان سکا ہاں عامر عثمانی سے ایک زمانہ واقف ہو گیا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانیؒ مفکر ملت حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، ان کے خاندان اور علمی دنیا کے ممتاز ترین افراد میں سے تھے علم، کمال، ادبی ذوق، تحقیق و جستجو، شاعرانہ خیالات، برجستگی، بیساختگی، متانت و سنجیدگی ان کو ورثہ میں ملی تھی اپنے بزرگوں اور بڑوں کی راہ سے ہٹ کر انہوں نے اپنا الگ راستہ بنایا اور اختیار کیا فطری ذہانت اور طبعی میلان کی بنیاد پر جملہ اصناف سخن پر ان کی گرفت تھی اور ہر موضوع پر ان کا قلم روانی کے ساتھ چلتا تھا تجلی کے عام شماروں کے اکثر صفحات ان کے قلم کے مرہون منت ہوتے جن میں وہ ایک کامیاب انشاء پرداز، ایک محقق، ایک قلم کار، ایک ادیب ایک صحافی، ایک نقاد، ایک مبصر، ایک شاعر کی صورت میں جلوہ گر ہوتے زور بیان، قوت استدلال، مشاہدہ اور تجربہ بھرے ہوئے سمندر کا منظر پیش کرتا۔

عامر صاحب نے اپنی زندگی میں نہ معلوم کتنی علمی اور ادبی جنگیں لڑیں ان معرکوں میں ان کو شکست ملی یا فتح اس کا علم تو اہل علم کو ہی ہوگا، مگر ان کی فکری جولانیاں پہاڑ کی چوٹیوں کو چومتیں اور دریاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیتیں ان کی نوکیلی اور نشتر کی طرح چبھنے والی تحریریں بہت سوں کو تلملانے پر مجبور کرتیں اور بہت سوں کی ہمت پست کر دیتیں ان کی طرف بڑھتے ہوئے طوفان کے قدم خود بخود رک جاتے اور چند ماہ کے وقفہ سے پھر عامر عثمانی صاحب کسی دوسرے موضوع پر دادِ تحقیق دیتے نظر آتے کچھ سال کے بعد تجلی کے پرانے شماروں کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہوا اور کافی پرچے میں نے جمع بھی کر لئے اور ایک حد تک ان کا مطالعہ بھی کیا اس مطالعہ کے بعد ایک نئے عامر عثمانیؒ سے ہمارا تعارف ہوا وہ عامر عثمانیؒ جو ملا ابن

العرب نکی کے روپ میں بھاتا تھا وہ طلاق نمبر، حاصل مطالعہ نمبر، ایمان نمبر، نقد ونظر نمبر، ڈاک نمبر، تنقید نمبر، خلافت وملوکیت نمبر میں نئے چہرہ کے ساتھ سامنے آ کھڑا ہوا اور پھر یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ ایک صحافی ہے، یا ایک نقاد یا ایک ادیب ہے یا ایک شاعر، ہر سمت میں ان کی صلاحیتوں کے چراغ جلتے اور لو دیتے نظر آئے۔

عامر عثمانیؒ صاحب کو میں نے دو تین بار دیکھا ایک بار تو ماہنامہ ''تجلی'' کے دفتر میں اور دو بار بازار یا محلّہ سے گزرتے ہوئے اور تینوں بار ان کی ایک ہی حالت دیکھی کہ وہ مطالعہ میں مصروف ہیں دفتر میں یہ صورت تھی تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر بازار اور سڑک کے کنارے بھی چلتے ہوئے میں نے ان کے ہاتھ میں کھلی ہوئی کتاب دیکھی جس پر ان کی نگاہیں ٹکی ہوتیں اور وہ بہت آہستگی اور خاموشی سے مطالعہ کرتے ہوئے گذر جاتے ان کی چال ڈھال اور لباس سے ان کی آفاقی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا، مگر ان کو پڑھنے کے بعد ان کی علمی، تحریری اور ادبی عظمتوں کا اعتراف کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

عامر عثمانیؒ جتنے اعلیٰ پائے کے ادیب اور قلمکار تھے اتنے ہی بلند فکر کے شاعر بھی تھے ان کی شاعری ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے تجلی کے علاوہ ان کی غزلیں اور نظمیں مشاعروں اور مختلف رسائل کے ذریعہ بھی سامنے آئیں ان کی شاعری نے بھی ان کو شہرت، عظمت اور مقبولیت عطا کی دیوبند کی ادبی زندگی میں وہ تنہا شخص تھے جو مختلف النوع میدانوں میں کامیابی کے ساتھ اپنے جوہر دکھاتے تھے، شاعری میں ان کی شخصیت اور فکر کے بہت سے پہلو سامنے آئے اور اپنے دور کے دیگر نامور اور شعراء کی صف میں انہوں نے جگہ پائی ان کے کلام کا ایک حصہ ''یہ قدم قدم بلائیں'' کے نام سے ان کے انتقال کے طویل عرصہ کے بعد منظر عام پر آچکا ہے ماہنامہ تجلی میں انہوں نے حفیظ جالندھری کے ''شاہنامۂ اسلام'' کے طرز پر ''شاہنامۂ اسلام'' کی شروعات کی تھی جو برسہا برس تک سلسلہ وار شائع ہوتا رہا نظم میں بھی ان کا

اپنا رنگ تھا اسی طرح غزل اور نظم دونوں ان کے لئے سہل اور آسان تھی ان کے عظیم ذخیرہ اشعار میں سے چند شعر قارئین کی دلچسپی کے لیے نقل کرتا ہوں۔

نہ سکت ہے ضبطِ غم کی، نہ مجال اشکباری
یہ عجیب کیفیت ہے نہ سکوں نہ بیقراری

یہ قدم قدم بلائیں یہ سواد کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

مرحبا! اے کوششِ ضبط مسلسل مرحبا
آج ان کو آرزومندِ فغاں پاتا ہوں میں

بے سوز و تپش بے درد و خلش، ہے عمرِ ابد بھی لا حاصل
آغاز وہی ہے جینے کا، جب دل کو تڑپنا آتا ہے

غرور عجز بھی ہے بندگی کا ایک مقام
مگر خدا نہ کرے یہ مقام آجائے

نعت کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمالیں۔

تمہاری نعت کے قربان جان و دل لیکن
تمہاری نعت کے قابل کہاں زبان وقلم

قلم کی نوک پہ الفاظ تو بہت ہیں مگر
ثبوت صدق ومعانی کریں کہاں سے ہم

چڑھی ہوئی ہیں زباں پر کثافتوں کی تہیں
پھر اس زبان سے کیسے تمہاری نعت کہوں

عامر صاحبؒ کو خدا وند قدوس نے بے پناہ ذہانت، ذکاوت، اور تخلیقی صلاحیتوں سے نواز تھا ان کا ذہن نہ تھکتا تھا اور نہ کسی موضوع پر وہ ہار مانتے تھے، استدلال کی جس قوت کا میں نے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ عامر صاحب کے یہاں بے ا

تہا موجود تھی ہر موقع پر وہ اپنی اس قوت کا کرشمہ دکھاتے مطالعہ ان کا بلاشبہ وسیع تھا یہاں تک کہ بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور جدید تقاضوں سے بھی وہ واقف تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری گذرے وقت کی داستان نہیں حالات حاضرہ کا بیان ہے فکر کی لذت، خیالات کی نزاکت، جذبے اور احساس کی شدت، فنی باریکیوں پر واقفیت، استعارات وتشبیہات سے آشنائی، لطیف اور پاکیزہ سوچ ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں فکر وخیال اور جذبے واحساس کا جو کمال شاعری کے تن مردہ میں زندگی کی روح بن کر دوڑتا اور پھر دوسروں کے احساسات اور خیالات کو اپنا ہمنوا بناتا ہے وہ کمال عامر عثمانی کا حصہ تھا جس پر کسی دوسرے کی اجارہ داری کا دعویٰ قبول نہیں کیا جا سکتا عامر صاحب کے اس تذکرہ میں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ان کے سب ہی حقیقی بھائی زبیر افضل عثمانی، عثمان غنی رہرو، فضل الرحمٰن یوسف اور علی اکبر عثمانی پختہ گو شاعروں میں سے تھے اور آج ان کے برادر خورد عمر فاروق عاصم اور ان کے صاحبزادے عبداللہ راہی عروس شاعری کی ناز برداریوں میں مصروف ہیں ان کے حقیقی چچا زاد بھائی مسعود جاوید صاحب مرحوم (جو حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے دور اہتمام میں دارالعلوم کے ناظم محاسبی رہے) جاسوسی ناول نگاری کی دنیا میں قد آور شخصیت کے مالک تھے، ان کے طبع زاد ناولوں اور تراجم کی تعداد ایک سو سے زائد ہے دوسرے حقیقی چچازاد بھائی شمس نوید عثمانی ادب وانشاء کا جانا پہچانا نام ہے اور ان کی دو کتابیں خاص طور پر قبولیت عام کے درجہ کو پہنچیں ایک "کیا ہم مسلمان ہیں اور دوسری...... اگر اب بھی نہ جاگے تو" ان کے علاوہ ان کے علمی اور ادبی مضامین کی تعداد کا شمار ممکن نہیں۔

عامر عثمانیؒ جس نسل کے لوگوں میں سے تھے ان میں علامہ انور صابری مرحوم، سید ازہر شاہ قیصر مرحوم، سید محبوب رضویؒ، جمیل مہدی مرحوم وغیرہ آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور پندرہ بیس سال کے عرصہ میں دیوبند کی ان نمائندہ ادبی شخصیتوں نے دوسرے عالم میں اپنا ٹھکانا بنالیا چند پرانے چراغ ہیں جو ٹمٹمارہے

یں اپریل ۷۵ء میں ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے مولانا عامر عثمانی دیوبند سے باہر تشریف لئے گئے اور پھر واپس نہ ہوئے ،۱۲ر اپریل ۱۹۷۵ء کو انہوں نے آخری سانس لیا اور اس طرح ایک باکمال انسان ہمارے درمیان سے اٹھ گیا عامر صاحب سے بہت سے لوگوں کو اختلاف رہا اور ہوسکتا ہے یہ اختلاف آج بھی ہو مگر میرا یہ مضمون اس اختلافی خلیج کو پاٹنے کی کوشش نہیں بلکہ اس سلسلہ کا ایک حصہ ہے، جو خاص طور پر دیوبند کی شخصیات پر، ''ترجمان دیوبند'' کے صفحات پر شروع کیا گیا ہے اور جس کا مقصد دیوبند کی نمایاں اور بلند شخصیات کی یادیں تازہ کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

دیوبند کی ادبی وصحافتی روایتوں کے ترجمان

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

ہر ایک عہد میں کچھ عالی مرتبہ افراد
زمیں پہ لکھتے رہے آسمان کی تاریخ

یادیں انسانی زندگی کا حسین ترین سرمایہ ہیں یہ یادیں تلخ بھی ہیں، اور شیریں بھی، کھٹی بھی ہیں اور میٹھی بھی، اِن یادوں کا تعلق سوزِ قلب سے بھی ہے اور سوزِ جگر سے بھی، میں جب یادوں کے نہاں خانہ میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو چند ایسے چہرے اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے ہوتے ہیں، جن کی فکری جولانیوں علمی سرفرازیوں اور ادبی بلند پروازیوں کی ایک خوبصورت اور حسین تاریخ ہے، صرف دیوبند ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ادبی اور صحافتی سلسلے جن کے ناموں سے روشن اور زندہ ہیں، دیوبند ایک چھوٹی سی بستی ہے، مگر خداوندِ قدوس نے علم وعمل اور فکر وادب کے وہ سانچے یہاں تیار کئے جن پر زمانہ فخر کرتا اور اپنے لئے قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہے وہ چند لوگ جن کے دَم سے ادب وصحافت کی راہیں اُجلی اور عطر بیز ہیں اُن میں ایک نام جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر (مرحوم) کا بھی ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مکمل دینی وعلمی ماحول اور اصحابِ علم کی موجودگی کے بعد بھی اعلیٰ اور روایتی تعلیم سے انسان محروم رہتا ہے، مگر اس کا ذوقِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ اُس کو بھٹکنے نہیں دیتی، اور وہ اپنی راہ الگ بنانے کے باوجود اُس ماحول اور افراد سے دور نہیں ہوتا ذاتی مطالعہ اور محنت کی بنیاد پر ایسے لوگ اپنی پہچان خود

بناتے ہیں اور پھر وقت اور تجربہ ایک دن اُن کو ایک سے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے، جہاں تک رسائی کا جذبہ ہر دل میں موجزن ہوتا ہے اُن بلندیوں کو چھونے کی ہر کوئی تمنا کرتا ہے۔

جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر حفظِ قرآن، دینیات اور فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم کے بعد نوعمری میں ادب وصحافت کی پُر خار وادیوں میں جا پہنچے اور اپنے فطری وطبعی میلان کی وجہ سے چند ہی سالوں میں کافی آگے نکل گئے اِدھر اُن کی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز تھا اور اُدھر متحدہ ہندوستان میں اُردو صحافت کا ڈنکا بج رہا تھا، دہلی سے لے کر امرتسر تک اور امرتسر سے آگے بڑھ کر لاہور خاص طور پر اس کے بڑے مراکز تھے، ایک جانب مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار کا طوطی بول رہا تھا تو دوسری جانب انقلاب لاہور، شہباز لاہور، احسان لاہور، کا شہرہ تھا، ایک طرف وحدت دہلی، الایمان دہلی، زمزم دہلی، مدینہ بجنور وغیرہ کے چرچے تھے تو دوسری طرف ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کا عروج تھا، اُسی زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے رسالے منادی کی گرفت بھی مضبوط تھی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے صدق اور سچ جیسے پرچوں کی شہرت عام تھی اس طرح چند سال آگے پیچھے کے حساب سے اس دور کو اُردو صحافت کے زرّیں دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس زرّیں اور تابناک دور میں ازہر شاہ قیصر مرحوم کے تحریری اور قلمی سفر کا آغاز ہوا، ذہانت اور حافظہ اُن کو ورثہ میں ملا تھا یادداشت گو بے مثال نہ تھی لیکن قابلِ رشک ضرور تھی، لگن، شوق اور جذبے نے اُن کا ہاتھ تھامے رکھا، وہ ابوالکلام آزاد، مولانا عثمان فارقیط وغیرہ کے طرزِ تحریر سے متأثر تھے، مگر اول دن سے انھوں نے اپنا ایک رنگ اختیار کیا جو نہ تو ابوالکلام آزاد سے مستعار تھا، اور نہ جسے عثمان فارقیط کی تقلید کہا جاسکتا، اُن کی تحریروں میں ادبی رنگ غالب تھا، انتہائی خشک موضوعات اور خالص دینی عنوانات پر بھی اُن کے قلم سے جو تحریریں نکلیں ان میں بھر

پورا ادبی چاشنی موجود ہے، سپاٹ اور خشک تحریروں کا اُن کے یہاں گذر نہ تھا، خداوندِ عالم نے اکثر اصناف میں اُن کو مہارت عطا فرمائی تھی، دینی اور اسلامی مضامین کا مطالعہ کیجئے، یا علمی و تحقیقی مقالات کا جائزہ لیجئے، ادبی وصحافتی شہ پاروں کو دیکھئے یا شخصیات پر اُن کی تاثراتی تحریروں پر نظر ڈالئے جو چیز بنیادی طور پر اُن سب میں آپ کو محسوس ہوگی وہ شاہ جی مرحوم کا مخصوص انداز ہوگا، تشبیہات واستعارات کا برجستہ استعمال، الفاظ ومحاورات پر گہری نظر اور تجربہ ومشاہدہ کی روشنی اُن تمام مضامین میں یکساں انداز میں موجود ہے، زُود نویس تھے مگر اس زُود نویسی نے ان کی تحریری خصوصیات کو قطعی متاثر نہیں کیا تھا، ہر تحریر اُجلی اور روشن، ہر جملہ پُر کشش اور جاذب، ہر عبارت فکر ونظر کا حسین عنوان تھی، مضمون نگاری کے اس لگے بندھے نظام کے قائل نہ تھے، جو ہمارے اکثر اہل قلم کے یہاں رائج ہے، مہینوں سوچئے ہفتوں تانے بانے بنئے اور پھر کہیں جا کر چند صفحات کا کوئی مضمون وجود میں آئے گا، مطالعہ کے مسلسل اہتمام نے ذہن کو اس درجہ بیدار اور متحرک کیا ہوا تھا کہ متعلقہ عنوان یا مطلوبہ موضوع پر ایک ہی نشست میں بے تکلفی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے، قلم رکھنے کی نوبت تو کیا آتی ایک جملے سے دوسرے جملے کا فاصلہ طے کرنے کے لئے قلم اُٹھانے کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتے ایک ہی نشست اور ایک ہی انداز میں صفحات کے صفحات لکھ دینا اُن کے لئے نہایت سہل اور آسان تھا۔

دیو بند کو جن افراد کی ادبی، صحافتی اور شعری خدمات سے جانا جاتا ہے ان میں بہت سے نامور لوگوں کے نام شامل ہیں، مگر جہاں تک اعلیٰ صحافتی خدمات کا تعلق ہے تو جناب جمیل مہدی مرحوم مدیر روزنامہ عزائم لکھنؤ اور جناب سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کا نام بغیر کسی پس وپیش کے لکھا جائے گا، اس ذیل میں اگر آپ کچھ اور ناموں کا اضافہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں ورنہ بظاہر یہی دو نام ہیں جن کے گرد دیو بند کی صحافت کی تاریخ گھومتی ہے، ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ اشکال ہو کہ علامہ انور صابری

مرحوم، مولانا عامر عثمانی مرحوم، جنا سید محبوب رضوی مرحوم، مولانا سید عبدالرؤف عالی، جناب عبداللہ جاوید صاحب، مولانا ریاست علی صاحب، جناب حامد تحسین صاحب، مولانا قمر عثمانی صاحب، جناب مفتی کفیل الرحمٰن نشاط صاحب، جناب مولانا حسن احمد صدیقی صاحب، مولانا ندیم الواجدی صاحب وغیرہ کا تعلق کیا صحافت سے نہیں ہے؟ تو میرا جواب یہ ہوگا، کہ یہ حضرات ادب کی دیگر اصناف پر بھرپور اور مکمل طریقے پر لکھنے اور کہنے والے رہے اور ہیں البتہ مولانا شاہین جمالی صاحب اور جناب اظہر صدیقی صاحب کے نام بھی اِس وقت اُسی صحافتی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جس صحافتی سلسلے کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کے یہاں لکھنا ایک عبادت اور ایک نیک جذبے کا نام تھا انہوں نے پوری عمر صلے کی پرواہ اور ستائش کی تمنا کئے بغیر ہی بے تکان لکھا اُن کے دور کے لوگوں میں یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انہوں نے کبھی پیشہ ورانہ انداز اختیار نہ کیا آج ہر شعبے میں پیشے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ہر اسٹیج پر مختلف فنکار بحیثیت پیشہ ور منسلک ہیں اور اپنی تخلیقات کی پوری پوری قیمت وصول کر رہے ہیں پھر ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور تیز رفتاری نے بھی ان صاحب صلاحیت بلکہ زیادہ تر بے صلاحیت افراد کو خوب پھولنے اور پھلنے کے مواقع عطا فرمائے ہیں جب فن پیشے کی حدود میں داخل ہو جائے تو وہ بے روح ہو جاتا ہے اور فنکار اُس مشین کی مانند ہو جاتا ہے جو جذبات واحساسات سے عاری ہوتی ہے، اس بات کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے جس کو بیان کئے بغیر میری بات مکمل نہیں ہوگی، موجودہ دور کے فنکاروں کی ہوسِ زر، موقع پرستی اور چاپلوسی نے بھی حقیقی فنکاروں کو طاق میں بٹھا دیا ہے اور وہ بے چارے کہ جن کے نام کے چرچے ہونے چاہئیں تھے خودداری اور انا کی چادر اوڑھے گمنامی اور محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اکثر ان ہی کو آپ دندناتے ہوئے دیکھیں گے جو اندر سے بالکل خالی مگر ہر ظاہری حربہ کے استعمال میں مستعد اور چاق وچوبند ہیں۔

جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کی پوری زندگی جن بنیادوں پر ٹکی دکھائی دیتی ہے اُن میں چند ایسی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اُن کے ساتھ ناانصافی کہلائے گا، وہ ایک صاحب قلم شخصیت، ایک صاحب فکر انسان، ایک صاحب طرز ادیب ایک انشا پرداز کی بناء پر ہی اپنے حلقہ میں متعارف و معتبر نہ تھے بلکہ بحیثیت ایک انسان بھی اُن کی خاص پہچان ہے انسانی ہمدردی اور جذبۂ خیر اُن کے خمیر کا حصہ تھا اپنے پرائے شناسا اور اجنبی سب کے لئے اُن کے دروازے کھلے ہوئے تھے، وہ رئیس یا ابنِ رئیس نہ تھے کہ دونوں ہاتھوں سے ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرتے اور اُن کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیتے، ہاں! اپنے نامور والد کی وجہ سے اُن کے تعلقات کافی وسیع تھے، سیاسی، ادبی، سماجی، ہر طرح کے مؤثر اور معروف اشخاص تک اُن کی پہنچ تھی سب ہی جگہ اُن کی قدر ہوتی تھی اور ہر حلقہ میں اُن کی پذیرائی کی جاتی تھی، ان تعلقات اور وسائل کو ان تمام لوگوں کے لئے وہ استعمال کرتے تھے جو اپنی ضرورتوں، دشواریوں اور مسائل میں اُن سے مدد کے خواہاں ہوتے، ہر تعاون کے لئے وہ آمادہ اور تیار رہتے ذاتی طور پر بھی اگر کسی موقع پر وہ اپنے آپ کو اس قابل پاتے کہ کسی کی خبر گیری کرسکیں تو اس سے دریغ نہ کرتے، پریشان حال لوگوں اور غربت کی تپش میں جھلتے انسانوں کو چند لمحے ان کے ساتھ گذار کر طمانیت اور قلبی سکون کا احساس ہوتا تھا، تفکرات کے مارے اور غمِ روزگار کے ستائے بہت سے لوگ ان کے پاس آتے، اور تھوڑی دیر کے بعد آنکھوں میں زندگی کی چمک اور ہونٹوں پر زندہ مسکراہٹ لئے واپس ہوئے، صاف گوئی عادتِ ثانیہ تھی، اس صاف گوئی کے لئے کسی خاص موقع اور محل کے متلاشی نہ ہوتے معاملہ کو جیسا دیکھا اور جیسا محسوس کیا اسی وقت اپنی رائے کا اظہار کردیا، پرداز ایسا ہوتا کہ کسی کی دل شکنی نہ ہوتی اور متعلقہ افراد میں سے کوئی بھی شخص کڑواہٹ محسوس نہ کرتا۔

دُوراندیش اور دُوربیں تھے، ابتداء ہی میں مسائل و معاملات کا اندازہ کرلینا

اور پھر نتائج پر گہری نظر رکھنا اُن کا امتیاز تھا لوگوں کو پہچاننے اور افراد کی فطرتوں کو سمجھ لینے کا ملکہ تھا کسی شخص کے بارے میں کوئی تبصرہ یا کسی آدمی کے سلسلے میں کسی رائے کا اظہار کر دیا، جلد یا بدیر وہ تبصرہ اور رائے صحیح ثابت ہوتی، اُن کے تبصرہ کے گھیرے میں آنے والے وہ بھی تھے جو آج دنیا سے پردہ کر چکے اور وہ بھی جو صرف اپنے لئے جی رہے ہیں، دونوں طرح کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ انہوں نے کہا ہم نے ان کو ویسا ہی پایا اور ویسا ہی تجربہ ہمارے سامنے ہے جری اور بیباک تھے، نہ کسی ہنگامے سے گھبراتے اور نہ کسی خوف کا شکار ہوتے، مردانہ وار ہر دشواری کا مقابلہ کرتے، ان کے فلک شگاف قہقہوں کے نیچے کرب والم کی ہزار کہانیوں نے دَم توڑ دیا، کبھی بکھرے نہیں، کبھی ٹوٹے نہیں ہاں! آخری قضیہ میں وہ مضمحل ہو کر شکست کھا گئے، گو براہِ راست اس میں اُن کی شمولیت نہ تھی مگر جماعت کے انتشار نے ان کو توڑ کر رکھ دیا اور زندگی کی شام ہونے سے پہلے ہی اُن کے رات دن مایوسیوں اور دل شکنی کے اندھیروں میں ڈوب گئے اور ایسے ڈوبے کہ اگلے دن کا سورج پھر طلوع نہ ہوا اور وہ سویرا ہی نہ آیا جس کی تلاش میں آج بھی قافلے کے بچے کھچے افراد امیدوں کا دامن تھامے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور کسی خدائی مدد کی آس میں جن کی نگاہیں آسمان کا طواف کرتی رہتی ہیں۔

ہمارے اعلیٰ دینی تعلیمی اداروں میں کبھی بھی یہ طریقہ نہیں رہا کہ کسی شخص کی دینی، علمی، تحریری خدمات پر اس کو کسی اعزاز سے نوازا جائے ہاں! اگر ''فاضل'' کا لفظ کسی کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے اس کے ساتھ کبھی کوئی خصوصی معاملہ ہو جائے تو ہو جائے مگر وہ افراد جنہوں نے پوری عمر دین کی خدمت میں لگا دی اور ذہن وفکر کی تمام توانائیاں صحیح تخلیقی عمل میں صرف کر دیں وہ کبھی توجہ کے مستحق نہیں ہوئے، یونیورسٹیوں میں آج جس طرح ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تقسیم کی جارہی ہیں تحریری صلاحیتوں سے محروم اور اپنے موضوعات کی اہمیت سے بے خبر لوگ بھی بائیں ہاتھوں

میں ڈگریاں لئے چلے آرہے ہیں، ایسے میں بار بار یہ خیال آتا ہے کاش مدارس بھی اپنے حلقہ میں نمایاں خدمات انجام دینے والے افراد کو اعزازات سے نوازتے اور اُن کے کاموں کو سراہتے۔

جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کے مضامین کی تعداد کا اندازہ لگانا ایک مشکل کام ہے۔ ۱۳؍ برس کی عمر سے لے کر ٦۷؍ برس کی منزل تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے اتنا لکھا کہ اپنی مصروفیات کی بناء پر اس ذخیرہ کی حفاظت نہ کرسکے، ہزاروں اخبارات ورسائل دیمک کی خوراک بن گئے، کم وبیش ایک سو پچاس رسائل وجرائد میں انہوں نے مسلسل یا وقفہ وقفہ کے ساتھ لکھا۔ کوئی مستقل کتاب ان کے قلم سے نہیں نکلی مگر مضامین کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ''یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ'' شخصیات پر لکھے اُن کے مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جو شخصیت نگاری کی دنیا میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے، اس مجموعے میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے لے کر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ جیسے اربابِ علم کے تذکرے کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مظہر علی اظہر وغیرہ سرکردہ سیاسی شخصیتوں کے خاکے بھی شامل ہیں، جگر مرادآبادی، احسان دانش، رَوِش صدیقی کے فکر وفن پر بھی اس کتاب میں خوب خوب روشنی ڈالی گئی ہے، ''متفرقات'' ان کے سیاسی، سماجی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، ''حیاتِ انور'' حضرت امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی پہلی ایسی اردو سوانح ہے جس میں اُن کے نامور تلامذہ کے وقیع اور علمی مضامین شامل کئے گئے ہیں اس مجموعے میں شامل خود شاہ جی مرحوم کا مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے، ہفت روزہ 'قومی آواز'' نئی دہلی میں ان کا ایک طویل مضمون ''سفینۂ وطن کے ناخدا'' سلسلہ وار شائع ہوا اور جو بعد میں ایک مختصر مجموعے کی صورت میں منظر عام پر آیا ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ بھی راقم نے

ترتیب دیا جو ''مقبول تقریریں'' کے نام سے بازار میں دستیاب ہے اور جس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

اپنی زندگی میں انہوں نے متعدد جرائد ورسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیئے، دارالعلوم کا ترجمان ''رسالہ دارالعلوم'' کم وبیش چالیس سال ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا، رسالہ ''ہادی'' دیوبند، رسالہ 'خالد'' دیوبند، اخبار ''استقلال'' دیوبند، اخبار ''صداقت'' سہارنپور، اخبار ''انور'' دیوبند، ماہنامہ 'طیب'' دیوبند، پندرہ روزہ ''اشاعتِ حق'' دیوبند ان کی ادارتی زندگی کی یادگار ہیں، آخرالذکر تینوں پرچے ذاتی پرچے تھے ان کے انتقال کے بعد راقم نے ماہنامہ ''طیب'' کا ''شاہ نمبر'' شائع کیا جو شاہ جی مرحوم کی خدمات اور کاموں پر محیط تھا اور جس میں نامور اہل قلم کے مضامین شامل تھے، دیوبند میں اگر کسی صاحب قلم پر کوئی نمبر شائع ہوا ہے تو وہ صرف ماہنامہ ''تجلی'' دیوبند کا مولانا عامر عثمانی مرحوم نمبر اور ماہنامہ ''طیب'' کا ''شاہ نمبر'' ہے، باقی حضرات کے کاموں اور کارناموں کا کوئی مبسوط تذکرہ ابھی تک سامنے نہیں آسکا ہے، حالانکہ دیوبند کی ادبی وصحافتی تاریخ روشن بھی ہے اور قابل فخر بھی۔

میں اپنے اس مضمون کا اختتام ''شاہ نمبر'' میں شامل صاحب قلم اور صاحب علم افراد کے مضامین چند اقتباسات پر کرتا ہوں ان اقتباسات سے شاہ جی مرحوم کی ادبی اور صحافتی زندگی کے کچھ پہلو نکھر کر سامنے آتے ہیں، مولانا سید عبدالرؤف عالی صاحب نے لکھا تھا:

> ''یوں تو سید ازہر شاہ قیصر نے بیشمار جرائد کی کالم نویسی میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا لیکن خداداد صلاحیتوں نے صحافت کی دنیا میں اپنی ایک الگ اور ممتاز حیثیت بخشی، انہوں نے بات کہنے کا نیا آہنگ اور نیا لب ولہجہ اپنایا، اُن کی انشاء پردازی دوسروں سے بالکل مختلف تھی غور کیجئے تو وہ صحافت کے میدان میں

صاحب طرز انشاء پرداز تھے، ان کی انشاء بظاہر تو دوسروں سے
جدا اور الگ معلوم نہیں ہوتی تھی مگر اس کی روانی، سلاست،
رسیلا پن، بے باکی اور حقیقت بیانی ایسی پرتاثیر ہوتی تھی کہ کسی
موضوع پر ان کے خیالات اور نقطۂ نظر پڑھنے کے بعد قاری ان
کے ساتھ ساتھ ہو جاتا تھا۔"

صاحبزادۂ حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہ استاذ تفسیر وحدیث دارالعلوم (وقف) کے طویل اور سیر حاصل مضمون کے یہ جملے دیکھئے:

"شاہ صاحب کی تحریر کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ روانی وسلاست کے ساتھ ساتھ اس میں ادبیت اور استعارات کے ذریعہ تعبیری چاشنی بھی ہمدوش ہوتی، ہلکے پھلکے الفاظ میں استعارات اور تشبیہی اندازِ بیان ان کی تحریر کا خاصہ تھا جو ناگوار ہونے کے بجائے اپنی بے ساختگی کی وجہ سے قاری کے ذہن پر اپنے خوش گوار اثر چھوڑ جاتے ہیں۔"

ممتاز عالم دین اور صاحبِ علم شخصیت محترم مولانا شاہین جمالی صاحب کے مضمون کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے:

"حضرت شاہ صاحب دیوبند کے ادب وصحافت کی آبرو اور اس کی
عظمت وناموس کے محافظ اور ادب وصحافت کی پچھلی پاکیزہ شخصیات
کی باقیات صالحات میں سے تھے جن کے وجودِ مسعود سے ادب
وصحافت کی مشرقی تہذیب وروایت کا تسلسل برقرار تھا۔"

معروف علمی وادبی شخصیت مولانا قمر عثمانی صاحب استاد دارالعلوم (وقف) کا یہ تأثر تھا:

شاہ جی مرحوم ایک کامیاب صحافی، ایک ممتاز ادیب ایک
صاحب طرز اہل قلم، ایک منفرد مبصر کی حیثیت سے سینوں اور

سفینوں میں تا دیر زندہ رہیں گے۔

۲۷؍نومبر ۱۹۸۵ء کو ایک نامور صحافی، ایک معروف انشاء پرداز اور ایک منفرد صاحب قلم کی اس دنیا سے روانگی نہ تھی بلکہ ایک پاکیزہ عادات شخص، ایک نیک فکر انسان، ایک دردمند اور ہمدرد آدمی بھی ہمارے درمیان سے اٹھ گیا اور اس طرح ادبی وصحافتی تاریخ کی وہ کڑی بھی ٹوٹ گئی جس سے نئی اور پرانی نسل کے رشتے جڑے ہوئے تھے، ان خوبصورت اور حسین روایات کا اختتام ہو گیا جو ان کے دم سے شاداب تھیں وقت کے پیروں میں کون بیڑیاں ڈال سکا ہے دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹؍برس بیت گئے ان کو گذرے ہوئے مگر کون سا دن ہے جب ان کی یاد نے نہ ستایا ہو، کون سی رات ہے جب ان کا چہرہ سامنے نہیں ہوتا، ہر صبح بے مزہ اور ہر شام بے کیف ہے۔

رونقِ بزم تھی وابستہ تمہارے دم سے
تم نہ ہوگے تو بہت یاد کرے گی دنیا

❁ ❁ ❁

مؤرّخِ دیوبند

جناب سید محبوب رضوی صاحب مرحوم

ظاہری حسن کے ساتھ باطنی خوبیوں کا مشاہدہ نہ بار بار ہوتا ہے اور نہ زندگی میں ایسے لوگوں کی بار بار زیارت ہوا کرتی ہے میں اگر اس پر فخر کروں کہ میں نے ایسے چند لوگوں کو دیکھا ہے جن کو خداوند قدوس نے حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل سے بھی نوازا تھا، تو میرا یہ فخر بیجا نہ ہوگا، اسے میں اپنے لئے عطیۂ الٰہی اور سعادتِ دارین تصور کرتا ہوں، دارالعلوم کے بے شمار نامور فضلاء میں سے کچھ کی زیارت میرا حصہ بنی ہے، بلاشبہ وہ تمام افراد علم وعمل کا جیتا جاگتا پیکر تھے ان کی خدماتِ جلیلہ اور تاریخی کارناموں کے بیان کے لئے ضخیم جلدیں بھی ناکافی ہیں، فضلائے دارالعلوم کے علاوہ دارالعلوم سے منسلک ایک جماعت ایسی ہمیشہ رہی ہے، جس نے نیکی و پاک بازی، علم و دانش اور ادب وصحافت کی ایک الگ تاریخ رقم کی گو یہ حضرات باقاعدہ دارالعلوم کے فاضل نہیں تھے، مگر دارالعلوم سے وابستگی اور تعلق کے بعد ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور اگر مبنی بر انصاف جائزہ لیا جائے تو ان کے باوقار کاموں کو فاضل نہ ہونے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک لمبی چوڑی فہرست اسی قبیل کے افراد کی ہے آج کی اس مجلس میں ایک ایسے ہی شخص کا تذکرہ مقصود ہے، جس کی پوری زندگی فکر و عمل سے عبارت ہے۔

جناب سید محبوب رضوی صاحب (مرحوم) کی پیدائش دیوبند میں ہوئی ان کا تعلق سادات کے ایک معزز خاندان سے تھا، ان کے بزرگوں کی کئی نسلیں سلوک وتصوف، نیکی اور اخلاص اور دیگر اوصافِ جمیلہ کی حامل تھیں محبوب صاحب کو اللہ تعالیٰ

نے مردانہ حسن اور خوبصورتی کا نمونہ بنایا تھا بڑے وجیہہ اور بارعب انسان تھے، باطن کا نوران کے چہرے اور پیشانی پر چمکتا تھا، مومنانہ وضع قطع'' مہذب اور شائستہ لباس عمر کی جس منزل میں میں نے ان کو دیکھا تو چہرہ پر گھنی سفید ڈاڑھی، آنکھوں پر خوبصورت چشمہ، نگاہوں میں پاکیزگی اور گفتگو میں متانت وسنجیدگی پائی علمی ذوق نکھرا ہوا تھا اور باوجودیکہ انہوں نے اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کی تھی مگر علمی تحقیقی مزاج کے مالک تھے، ذاتی محنت، لگن اور مطالعہ کی وجہ سے انہوں نے دیگر اصحابِ علم وفکر کے مقابلے میں اپنے لئے تاریخ کا میدان منتخب کیا، شب وروز تاریخ کی بھول بھلیوں کی کامیاب سیر کرتے، تاریخ کے دور دراز گوشوں تک پہنچتے اور وہ لعل وگوہر چن کر لاتے جس پر ان کے بزرگ اور ہم عصر فخر اور رشک کرتے، صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے، اور پاکیزہ خیالات انکا امتیاز تھا۔ اپنی گفتگو، لب ولہجے، اندازِ تخاطب اور سوچ کے اعتبار سے نہایت نفیس انسان تھے، مزاج میں کوٹ کوٹ کر شرافت اور مروّت بھری ہوئی تھی، بہت محتاط تھے، زبان وقلم سے کبھی کوئی بے احتیاطی ظاہر نہیں ہوئی، معاملات کے سچے اور پکے تھے، سلجھی ہوئی طبیعت کی وجہ سے نہ کبھی کسی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور نہ خود تنقید کا نشانہ بنے، ہاں! تحقیقی اور علمی اختلاف کے قائل تھے، مگر یہاں بھی تہذیب اور شائستگی ہمیشہ ان کے ہم عناں رہتی۔

ان کے ہزاروں علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین ومقالات ہند وپاک کے مشہور رسائل وجرائد میں شائع ہوئے، رسالہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید لاہور، ہفت روزہ ایشیا، لاہور، سہ روزہ الجمیعۃ دہلی، ماہنامہ ''برہان'' دہلی ماہنامہ ''ہادی'' دیوبند، ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڈھ ماہنامہ ''مولوی'' دہلی، ماہنامہ ''دین دینا'' دہلی ماہنانہ ''شمس الاسلام'' امرتسر، ماہنامہ ''مسلمہ'' امرتسر، ماہنامہ شمس المشائخ بھوپال، ماہنامہ عارف امرتسر وغیرہ اخبارات ورسائل میں انہوں نے خوب لکھا۔ بڑا عمدہ علمی ذوق تھا، تحریر میں چاشنی، روانی اور پختگی تھی، ہر تحریر ان کی علمی، فکری اور تحقیقی عرق

ریزیوں کا نتیجہ ہوتی تھی، جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا پورا حق ادا کرتے انہوں نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو بھی اپنی بلند نثر نگاری سے حسن اور جاذبیت بخشی، دارالعلوم کے حلقے میں ان کی تاریخی معلومات کو وقیع اور اہم سمجھا جاتا تھا، ٹھوس تاریخی حوالوں اور مستند مواد کے بغیر کوئی بات نہیں کرتے تھے، گفتگو اور تحریر دونوں میں ان کا تاریخی ذوق یکساں طور پر جھلکتا تھا، دارالعلوم سے متعلق اس جماعت کے وہ ایک باوقار رکن تھے، جس نے ادب وصحافت کی نمایاں خدمات انجام دیں ان کے معاصرین میں بہت سے اصحاب علم وفکر افراد شامل تھے، خود دیوبند میں اس وقت جو علمی وادبی بساط بچھی ہوئی تھی ان میں علامہ انور صابری مرحوم، مولانا عامر عثمانی مرحوم جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم جمیل مہدی مرحوم، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب، جناب زاہد قیصر صاحب، جناب مخمور عثمانی مرحوم، جناب منشی امتیاز احمد صاحب مرحوم، مولانا مسعود احمد قاسمی مرحوم مدیر ماہنامہ ہادی دیوبند وغیرہ کے بعد دوسری نسل کے مولانا سید انظر شاہ مسعودی، مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی، مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب، مولانا سید عبدالرؤف عالی، جناب شمس نوید عثمانی مرحوم، جناب اظہر صدیقی صاحب، مولانا قمر عثمانی صاحب مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی، جناب عادل صدیقی صاحب، جناب حامد تحسین صاحب اور پھر بعد کے لوگوں میں مولانا بدرالحسن قاسمی، مولانا محمد اسلام قاسمی، مولانا حسن احمد صدیقی، عبید اقبال عاصم اور برادرم مولانا ندیم الواجدی کے نام ممتاز ہیں، دیوبند کی علمی، دینی، فکری اور ادبی زندگی کو ان حضرات نے نہ صرف جلا بخشی بلکہ ایک بلند مقام عطا کیا۔

مولانا سید محبوب رضوی صاحب مرحوم کے قلم سے کئی گراں قدر اور قیمتی کاوشیں نکلیں جو عوام وخواص میں نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ ان کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت کو بھی تسلیم کیا گیا، مکتوباتِ نبوی، تاریخ دارالعلوم دو جلدیں، تاریخ دیوبند، تاریخ آبِ زمزم، مکاتیبِ حجاز جیسی انمول کتابیں ان کی صلاحیتوں کا بہترین تعارف

اور منہ بولتا ثبوت ہیں، مکتوباتِ نبوی میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام مکتوبات کو جمع کیا ہے، جو آپ نے اس وقت کے بادشاہوں اور سربراہانِ مملکت کو دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں لکھے، ان میں کئی خطوط دیگر صحابہ کے علاوہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دستِ مبارک سے لکھے گئے ہیں، ان خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ محبوب صاحب نے نہ صرف یہ کہ اصل خطوط شامل کتاب کئے بلکہ ان کا ترجمہ، زمانہ، حالات اور پس منظر بھی تحقیق وتدقیق کے بعد تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے، اس کتاب کے کئی ایڈیشن مختلف کتب خانوں سے شائع ہو چکے ہیں، تاریخ دار العلوم ان کا عظیم کارنامہ ہے، جس کو انہوں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر کے حکم اور ایماء پر دو جلدوں میں لکھا، دار العلوم اور اکابر دار العلوم پر فضلاء دار العلوم نے بڑا کام کیا ہے اور لاتعداد کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، مگر محبوب صاحب نے کئی سال کی مسلسل محنت اور ذاتی لگن وشوق کے ساتھ یہ تاریخ ترتیب دی، میں ان کے اس کام کو ان کا منفرد کارنامہ خیال کرتا ہوں، اس لئے کہ دوسروں کی محنت اور رات دن کی جانفشانیوں کو بغیر کسی تگ ودو کے دو چار جلدوں میں جمع کر دینا بہت آسان، سہل اور بہت قریب کا کام ہے، مگر ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر تاریخی حقائق کو پوری دیانت کے ساتھ سامنے لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، آنے والی ہر نسل کے لئے دار العلوم کی تاریخ کردار، عمل، خدمات اور کارناموں کو جاننے کے لئے تاریخ دار العلوم کا مطالعہ ہر صورت میں لازمی اور ضروری ہے۔

تاریخِ دیوبند لکھ کر انہوں نے اہل دیوبند پر احسان کیا ہے، دیوبند جیسی تاریخی اور قدیم بستی کی شاندار تاریخی روایتوں، قدامت اور مختلف نشیب وفراز کے بیان کے لئے کسی ایسے ہی دیدہ ور مصنف کی ضرورت تھی جو اپنی زندگی کا ہر قیمتی لمحہ اس کام پر لگا دے۔ پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ کتاب کہنے کو تو دیوبند کی تاریخ ہے لیکن درحقیقت اس

کتاب میں مسلمانانِ ہند کی مختلف علمی، دینی، سیاسی تحریکات، ان سے وابستہ افراد واشخاص اور پھران کے نتائج اور اثرات کا جامع تذکرہ سامنے آتا ہے، یہ مبسوط تاریخ ہے اور جس قدر محنت اس کو لکھنے میں کی گئی ہے اس سے محبوب صاحب کے تحقیقی مزاج کا پتہ لگالینا آسان ہے، کئی سال انہوں نے اس کام پر صرف کئے اور ہر حلقے میں ان کا یہ کارنامہ اہم قرار پایا، تاریخ آبِ زمزم دراصل ان کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جو بعد میں کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا، اس کتابچہ میں بھی اپنے موضوع کو محبوب صاحب نے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ سمیٹا ہے، ''مکاتیب حجاز'' ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے سفرحج کے دوران اپنے محبّ جناب سید ازہر شاہ قیصر کو لکھے، ان خطوط کی زبان نہایت شگفتہ اور سلیس ہے بیان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا دیارِ محبوب کی ہر کیفیت اور لذت سے محظوظ ہوتا ہے، ایک حاجی کا شوق ودیوانگی، ایک بندۂ مومن کا اضطراب و بے چینی، خالق ارض وسما کے مقدس گھر کی زیارت کا والہانہ جذبہ، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے روشن کوچوں اور گلیوں کا دیدار، حج کے مختلف ارکان، مسائل اور دعائیں بہت سے مقامات کی حاضری اس مجموعہ کی خصوصیت ہیں۔

تراجم قرآنی پر ایک نظر کے عنوان سے بھی ان کا ایک مفصل مضمون رسالہ دارالعلوم کی متعدد اشاعتوں کی زینت بنا اگر یہ طویل مقالہ کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے تو اہل علم کے لئے کام کی چیز ثابت ہو، اسی نوعیت کی ان کی اور بھی بہت سی چیزیں اخبارات ورسائل کے ڈھیر میں دبی ہوئی ہیں، مگر علم اور افراد کی بے قدری کے اس دور میں یہ چیزیں ضائع ہورہی ہیں، ایک فرد کی صورت میں محبوب صاحب نے جو کام انجام دیئے ہیں، وہ بہت قیمتی ہیں ان کی حفاظت کا کوئی معقول نظم ہونا چاہئے، لگ بھگ پچھتر سال کی عمر میں ۲۵ / مارچ ۱۹۷۹ء کو محبوب صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے، انہوں نے عمر کا بڑا حصہ علمی، دینی، ادبی اور قلمی کاموں میں صرف کیا، بنیادی طور پر وہ ایک مؤرخ کا ذہن اور نظر رکھتے تھے اور یہی میدان ان کے علم وفکر کی

جولان گاہ تھا، مگر اس موضوع سے ہٹ کر بھی انہوں نے خوب لکھا، ان کا تمام تر علمی فکری سرمایہ تعمیری اور صالح اقدار کے تحفظ کا امین ہے، اپنے وقت میں دارالعلوم کے جن افراد سے ان کا تعلق رہا وہ سب کے سب علم وادب کی نمایاں شخصیتوں میں شما رکئے جاتے تھے، ان میں سے اکثر حضرات خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ چکے ہیں، مگر ان کی درخشندہ خدمات تاریخ دیوبند کا خوبصورت اور جلی عنوان ہیں۔

محبوب صاحب کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نہ یہ کہ صرف دیوبند اپنے ایک قابل قدر فرزند سے محروم ہوا بلکہ دیوبند کی تاریخ کو زندگی بخشنے والا انسان، اچھے اخلاق واچھے کردار کا مالک ایک فرد، ایک دردمند اور مربی شخص تہذیب، سنجیدگی، متانت اور شائستگی کی ایک نشانی اور ایک علامت بھی ختم ہوگئی، راقم کو اپنی مضمون نگاری کے بالکل ابتدائی دور میں چند مضامین پر ان سے اصلاح لینے کی سعادت حاصل ہوئی اصلاح وتربیت کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک تو نہیں چل سکا مگر جتنا وقت بھی ان کی صحبت کا میسر ہوا وہ زندگی کا قیمتی اور یادگار وقت ہے اس پورے عرصے میں میں نے ان کو ایک مشفق اور مہربان آدمی پایا، ہر مرحلے پر حوصلہ افزائی اور ہر منزل پر ان کی سرپرستی مجھے حاصل رہی، خود کثیر المطالعہ تھے اس لئے بار بار مطالعے کی تاکید وہدایت کے ساتھ ساتھ کتابوں کی نشاندہی بھی کرتے کسی موقع اور کسی جگہ پر ملاقات ہوتی تو بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے اور پوچھتے کیا لکھ پڑھ رہے ہو، وہ نسل اور وہ افراد اب دنیا سے رخصت ہوئے جو اپنے چھوٹوں کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، دیوبند کی ادبی، صحافتی اور تحریری تاریخ جب بھی تدوین ہوگی تو محبوب صاحب کا نام اس تاریخ کا باوقار اور معتبر نام ہوگا، انہوں نے اس دنیا میں بڑی کامیاب زندگی گذاری، دعا ہے کہ رب العالمین وہاں بھی ان کو کامیابیوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

❁ ❁ ❁

ادب وصحافت کا قدآور انسان

جناب جمیل مہدی مرحوم

دیو بند کا نام جب ذہن میں اُبھرتا اور قلم کی نوک سے صفحۂ قرطاس پر لکھا جاتا ہے تو تاریخ کا ایک طویل سلسلہ خود بخود سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، ایک ایسی تاریخ جو علم وادب اور فکر وفن کی تاریخ ہے اور اس تاریخ کو گہرائی اور توانائی عطا کرنے میں جن لوگوں کا ہاتھ رہا وہ لوگ اس طرح سے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ان سے بچ کر نکلنے کی نہ تو ہمت ہوتی اور نہ کترا کر گذر جانے کو دل چاہتا ہے، تاریخ بنتی ہے افراد اشخاص سے اور اگر آپ ان افراد اور اشخاص کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے، تو یہ تاریخ بے لباس ہی نہیں بلکہ بے روح بھی کہلائے گی ایک ایسا شخص جس نے زندگی کے کم وبیش چالیس سال تحریر وقلم کی خدمت میں گذارے ہوں اس سے صرفِ نظر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

جناب جمیل مہدی مرحوم دیو بند کی سرزمین میں پیدا ہوئے اور اسی زمین کے ایک ٹکڑے کو اپنی آخری آرام گاہ بنایا، دیو بند کی مردم خیز خصوصیات ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جمیل صاحب نے جن لوگوں کی صحبت پائی اور انھیں جن لوگوں کا ساتھ حاصل رہا ان کے فکر اور خیالات کا گہرا اثر ان کی زندگی پر تھا وہی پچھلوں کی سی ادائیں، وہی بڑوں کا سا مشفقانہ طرزِ عمل اور اکابر کا سا وہی استغناء اور فقر، اپنے لیے نہ جینا اور اپنے لئے نہ کسی چیز کی خواہش، سب کچھ دوسروں کے لئے اور وہ بھی کسی صلہ اور ستائش کی پرواہ کئے بغیر۔ جس نسل سے ان کا تعلق تھا وہ نسل روایات کے تحفظ اور اخلاص وعمل کی

نورانیت کو زندگی کا اصل مقصد اور اصل سرمایہ تصور کرتی تھی ان کے یہاں زندگی کا تصور یہ تھا کہ جو لمحہ بھی ملک وقوم کی خدمت میں گذرے اور جتنا وقت بھی اعلیٰ اقدار کی حفاظت میں بیتے وہی لمحہ اور وہ وقت حاصلِ حیات ہے چنانچہ جمیل مہدی صاحب کی زندگی کے جس گوشہ کو بھی ہم دیکھتے ہیں وہ اخلاص، سادگی اور انسانی ہمدردی سے مہکتا نظر آتا ہے ان کی عمر کی کوئی منزل ایسی نظر نہیں آتی جہاں ٹھہر کر اطمینان کی چند سانسیں بھی انہوں اپنے لئے لی ہوں، ان کی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ قومی محبت اور ملی درد ان کے جسم میں لہو بن کر دوڑتا تھا ان کی تحریر میں بلا کی کاٹ تھی اور اس نشتر کی طرح اپنا کام کرتی تھی جو جسم سے فاسد مادے کو خارج کرنے کے لئے چلایا جاتا ہے، ایک ایسا آتش فشاں جو اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے اور پھر کسی بھی لمحے پھٹ پڑتا ہے۔

جمیل صاحب ۱۹۲۸ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے اور یہاں کی علمی وادبی فضاؤں میں ان کی پرورش ہوئی ان کے والد جناب مہدی حسن صاحب مرحوم دیوبند کے معروف لوگوں میں تھے، ان کی عمر کا ایک حصہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کی تحریک ''ریشمی رومال'' میں ایک رکن کی حیثیت سے گذرا، جمیل مہدی صاحب مرحوم نے اپنے والد کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''میرے والد شیخ الہند کی ریشمی خطوط کی تحریک میں شامل تھے، اور انگریزی میں خط وکتابت کی ساری ذمہ داریاں ان ہی کے سپرد تھیں۔''

ان کے والد نے ''سفر نامہ اسیر مالٹا'' ترتیب دے کر شائع کی، یہ دراصل مالٹا کی نظربندی کی مفصل اور مبسوط روداد ہے، جمیل صاحب کی تعلیم گویا زیادہ نہ تھی مگر ذہن رَسا، فطری ذہانت اور مطالعہ کے شوق نے ان کی تحریروں میں بلا کی روانی پیدا کردی تھی، اپنی تعلیم کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میری تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے، کیونکہ مڈل اور میٹرک اور عربی فارسی کی ابتدائی اور متوسط کتابوں کی تعلیم کو میں تعلیم نہیں

مانتا، ویسے ساٹھ سال کے قریب میری طویل عمر میں ایک بھی
موقع ایسا نہیں آیا کہ کسی نے میری رسمی تعلیم پوچھی ہو یا کوئی
سرٹیفکیٹ طلب کیا ہو، جو لوگ بقول ان کے میری استعداد پر
حیرت ظاہر کرتے ہیں انہیں میں یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہوں کہ
اس زمانہ میں جاہل میرے جیسے ہوا کرتے تھے، اب تم سوچ لو
کہ پڑھے لکھے اور عالم فاضل کیسے ہوتے ہوں گے، میری
زندگی کا سب سے بڑا تجربہ یہ ہے کہ علم کتابی نہیں ہوتا سماعی اور
تجرباتی ہوتا ہے، مجھے مولانا سندھیؒ نے حجۃ اللہ البالغہ سبقاً سبقاً
اس وقت پڑھانی شروع کی جب کہ میں عربی کا ایک لفظ نہیں
جانتا تھا، لیکن آگے چل کر کان میں پڑے ہوئے وہ تمام الفاظ نہ
صرف روشن ہوئے بلکہ آگے کی راہ کے لئے مشعل ہدایت بھی
ثابت ہوئے۔"

تعلیم کی کمی کو جمیل صاحب نے اس طرح پورا کیا کہ کتابوں کے ڈھیر کے درمیان بیٹھے رہتے اور اپنے ذوق وطلب کے مطابق مطالعہ کرتے رہتے، مسلمان حکومتوں کی تاریخ اور مسلمان حکمرانوں کے حالات اور اس دور کی سیاسی وسماجی زندگی پر ان کی گہری نظر تھی، عروج وزوال کی لاتعداد داستانیں انہیں ازبر تھیں انہوں نے مضمون نگاری کی ابتداء اس طرح کی کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی پوری توجہ انہیں حاصل تھی اور مختلف اسالیب وزبان وبیان پر قدرت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے یہ عجیب وغریب ڈھنگ نکالا کہ نامور ادیبوں اور معروف قلم کاروں کے تراشے انہیں تھما دیتے اور حکم ہوتا کہ اسی طرز اور انداز پر مضمون مکمل کر کے لاؤ، ابتدائی مشق کے بعد ہر اُسلوب اور طرزِ تحریر پر اس قدر قابو یافتہ ہو گئے کہ مضمون کی تکمیل کے بعد یہ پتہ لگا لینا بے حد مشکل کام تھا کہ یہ تحریر ابوالکلام آزاد کی ہے یا عبد

الماجد دریابادی کی ہے یا کسی تیسرے شخص کی محنت اور مشق کا نمونہ ہے۔

چند سال کے اندر ہی جمیل صاحب اپنا ایک انداز اور اسلوب قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، بے انتہا ذہین تھے، اور ان کا حافظہ غضب کا تھا، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، اُلجھے ہوئے بال، بے ترتیب لباس اور ظاہری کروفر سے کوسوں دُور، جمیل صاحب کی تحریریں اُردو صحافت کی شاہکار تحریریں ہیں، خاص طور پر جب ملکی اور ملی مسائل پر وہ گفتگو کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درد اور کرب کی ہر اذیت کو انہوں نے سہا اور غربت وافلاس کی ہر تاریکی کے قریب سے وہ گذرے ہیں مترادفات کا استعمال، پُر شکوہ زبان اور سنجیدہ و متین لب ولہجہ ان کی تحریروں کا امتیاز ہے۔

زندگی کے ابتدائی دور میں انہوں نے بمبئی کو اپنا ٹھکانہ بنایا اور شہرۂ آفاق اَدبی پرچے ''شاعر'' میں بحیثیت مدیر شریک رہے، روزنامہ ''جمہوریت'' بمبئی کی ادارتی ذمہ داری بھی نبھائی اور روزنامہ ''خلافت'' اور روزنامہ ''ہندوستان'' میں بھی ان کی اِدارتی صلاحیتوں کو تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک ان کے بھائی عقیل محزوں نیازی مرحوم (جو خود بھی بہت اچھے شاعر تھے) نے ایک سہ روزہ اخبار ''مرکز'' نکالا جس کے اداریے انہیں کے قلم سے نکلے، انہوں نے آخری پڑاؤ لکھنؤ میں ڈالا اور دمِ واپسیں تک لکھنؤ ہی ان کی قیام گاہ رہا، بلکہ یہاں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کہ دیوبند ان کے لئے وطن ثانی بن کر رہ گیا اور لکھنؤ وطن اصلی بن کر رہا، دس برس لکھنؤ سے ہفت روزہ ''عزائم'' جاری رہا اور پھر اتنا ہی عرصہ ''عزائم'' روزنامے کی شکل میں شائع ہوا، لکھنؤ کا زمانۂ قیام ان کے تحریری اور قلمی کارناموں کا سنہرا زمانہ ہے، ان کے مضامین کا صرف ایک انتخاب ڈاکٹر ذکی کاکوروی صاحب نے ''افکار وعزائم'' کے عنوان سے ترتیب دے کر شائع کیا اور جمیل صاحب ہی کی زندگی میں یہ منظر عام پر آیا اس مجموعے کے تمام مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس دل میں گھر کر لیتا ہے کہ جمیل صاحب اپنے طرز کے خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم

بھی، اس انداز کی تحریریں نہ ان سے پہلے لکھی گئیں اور نہ کسی نے ان کے بعد اس راہ پر چلنے کی کوشش کی، بڑی پختگی، بڑی جاذبیت اور غیر معمولی کشش ان کی تحریروں کا خاصہ ہے، چھوٹے چھوٹے جملے، رواں دواں بیان اور ماہرانہ دسترس نے ان کو انتہائی بلندیوں پر پہنچادیا تھا، یہاں پر اس تلخ حقیقت کے اظہار کو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ لکھنؤ نے جمیل صاحب کے سلسلے میں احسان فراموشی کی ایک تاریخ لکھی اور دیوبند نے اس میں پوری حصے داری نبھائی۔ ۱۳ر فروری ۱۹۸۸ء کو جمیل صاحب نے بساطِ زندگی سمیٹ لی، اس طرح چودہ سال گذر گئے اور جمیل صاحب کا نام کسی کی زبان پر نہیں آیا، جس طرح ساری عمر انہوں نے ملی کرب اور ملی درد میں گذاری اسی طرح یہ چودہ سال کا عرصہ بھی درد وکرب میں ہی گذر گیا ان کی تحریروں کے چند نمونے اس خیال کے ساتھ پیش خدمت ہیں کہ اُردو وصحافت کا یہ آخری سورج زندگی کی روشنی سے محروم ہونے تک اپنے پاکیزہ افکار اور دردمندانہ خیالات کی خوشبو ادب وصحافت کی وادیوں میں بکھیرتا رہا، ایک جگہ پر انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''زندہ قومیں اپنے زخموں کو گنتی نہیں انہیں یاد رکھتی ہیں، قومی وجود ایک مسلسل مزاحمت کا طالب ہوتا ہے، جو قومیں اس مزاحمت سے خالی اور اپنے فرض سے غافل ہوجاتی ہیں ان کا رشتہ ماضی سے کٹ جاتا ہے، وہ معلق اور مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔''

ایک اور جگہ ان کے افکار کی روشنی یوں اجالا کرتی ہے:

> ''ویسے تو دنیا کے اکثر پاگل بھی اپنے ہوشمند ہونے کا پورا یقین رکھتے ہیں لیکن ان کا یہ یقین ان کی دیوانگی کے لئے ذرا بھی مفید ثابت نہیں ہوتا، سچی بات تو یہ ہے کہ پورے بیس بائیس برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں نے غیر جانبدار اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ تک لینے کی کوشش نہیں کی کہ حالات نے

انہیں کیسے بے کنار صحرا میں لا کر چھوڑ دیا ہے، وہ تو اب تک روایتوں کی گرمی اور پچھلے کارناموں کے سحر میں ہی اتنے گرفتار ہیں کہ انہیں احساس تک نہیں کہ کتنی پُر ہول، یخ بستہ اور تاریک رات ان پر مسلط ہونے جا رہی ہے۔''

''کیا مسلمان دیکھ نہیں رہے ہیں کہ آج کے اعصاب اس سے کہیں کمزور اور ذہن اس سے کہیں زیادہ پریشان ہو چکے ہیں جو حالت اب سے بیس بائیس برس پہلے تھی، جب سوچنے کا وقت تھا تو خوش فہمیوں کی سیج پر بھی تان کر سوتے رہے، اب جب کہ سیلاب کا پانی گھروں میں داخل ہو گیا ہے تو دریا پر پشتہ لگانے کا تصور تک فضول اور بعد از وقت محسوس ہو رہا ہے، سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ نہ تو بیس برس پہلے کا طرزِ عمل صحیح تھا اور نہ بیس برس کے بعد کا یہ عمل صحیح کہا جا سکتا ہے، جس قوم کی رہنما عوام سے بھی اونچی اور بلند آواز میں ''اب کیا کریں؟'' کا جواب ایک دوسرے سے کرنے لگیں اس قوم کا حشر اس سے کم عبرت ناک ہو بھی نہیں سکتا جس سے اسے فی الحال سامنا کرنا پڑ رہا ہے، مسلمانوں کی قیادت پہلے ایک خیال تھی اب حسرت بن گئی ہے''۔

ان کی تحریروں کا انتخاب ہی اگر شائع کیا جائے تو فکر و نظر سے مزین وہ شہ پارے سامنے آسکتے ہیں جن کو آنے والی نسلیں اپنے سینوں سے لگانے پر مجبور ہوں گی، جن اشخاص اور افراد نے ان کی زندگی کو ایک صحیح سمت عطاء کی ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا طاہر صاحب قاسمیؒ برادر حضرت حکیم الاسلام، مولانا عزیر گلؒ رکن تحریک ریشمی رومال، حضرت علامہ ابراہیم

صاحب بلیاویؒ کے نام ممتاز ہیں، اخلاص، محبت اور سادگی کے ایسے نمونے اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے وہ لوگ دوسری دنیا میں جا بسے جنہوں نے ادب وصحافت کی بے لوث خدمت کی اور کبھی ذاتی تعیش وآرام اور عیش وعشرت کے لئے اس غریب اُردو زبان کو بطورِ زینہ استعمال نہیں کیا، خونِ جگر سے اس زبان کی آبیاری کرنے والے گو اس دنیا سے محروم تو نہیں ہو گئے مگر موجودہ دور کے شعبدہ باز فنکاروں کے مقابلے میں انہیں کچھ بھی نہ ملا آج اُردو کے قاتل ہر گلی اور کوچے میں گھوم رہے ہیں اور ان کی مکروہ وکان پھاڑ دینے والی آوازوں سے ماحول سہما ہوا ہے، ایسے میں اس مسیحا کو یاد کرنا اور اس کی خدمات کا اعتراف کرنا گو حق کی ادائیگی نہیں مگر حق کی سمت سفر کا آغاز ضرور ہے، افکار وعزائم کے مراتب ڈاکٹر ذکی کاکوروی کے یہ جملے جمیل صاحب کے مقام اور مرتبہ کی جانب ضرور اشارہ کرتے ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جمیل مہدی صاحب اُردو کے دورِ حاضر کے صف اول کے صحافی ہیں ان کے مضامین میں غیر معمولی علمی، اَدبی، تہذیبی اور معلوماتی خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی بات بلند نظری، وسیع المشربی حقائق پسندی اور بین الاقوامی معاملات کی پرکھ ہے''۔

جمیل مہدی صاحب کے مضامین میں انسانیت کا درد، اعلیٰ قدروں کا عرفان، غیر معمولی مشاہداتی کیفیت، جمہوریت اور حب الوطنی پر ایمان، غیر فرقہ وارانہ مزاج اور عالمی فلاح وبہبود کی تلاش کا جو عالم ہم کو ملتا ہے وہ اس دور میں کم از کم اُردو صحافت میں شاذ ونادر ہی نظر آئے گا۔

☆ ☆ ☆

نہ جانے کہاں کھو گئے؟

صادقؔ صابری

بہت سے باکمال اور صاحب فن ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے میدان میں بھر پور صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ضائع ہو جاتے ہیں اور وقت ان کے ساتھ عجیب کھیل کھیلتا ہے ایسے لوگ جو مقام بھی حاصل کرنا چاہیں چند قدم چل کر وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں اور جو فاصلہ دوسرے سالوں کے بعد طے کرتے ہیں وہ کم وقت میں مسافت طے کر کے اپنی شناخت اور اپنی پہچان بنا لیتے ہیں لیکن عموماً ایسا ہوتا نہیں بہت سے اپنی حدود سے باہر نہیں نکل پاتے، کچھ اپنی ذات میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ صرف آگے بڑھنے کے جذبہ اور جنون کے سہارے اتنی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں جس کے وہ کبھی بھی مستحق نہیں ہو سکتے۔

صادقؔ صابری دیو بند کی ادبی شخصیتوں میں ایک ایسا ہی نام ہے جس کو خداوند عالم نے شعر و فکر کی خاص نعمت سے نوازا تھا ادبی تقاضوں اور نشیب و فراز پر جس کی نظر تھی جس نے ادبی روایتوں کی پوری پاسداری کی اور متانت و سنجیدگی کی ہر کڑی کو تھامے رکھا حس لطیف کو بیدار کرنے اور گدگدانے میں کمال درجہ کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اس کی ہلکی سی چٹکی سے پرت کے پرت کھل جاتے اور حقائق کی ایک ایسی دنیا آباد نظر آتی جہاں روشنی ہوتی، اجالا ہوتا، قہقہے اور مسکراہٹیں ہوتیں، شاید وہ دیو بند میں تنہا ایسا شاعر ہے جس کے اشعار لوگوں کو ازبر ہیں طویل ترین نظمیں بھی اس طرح حافظہ میں محفوظ ہیں کہ دوسرے شعراء کے حصہ میں حسرت اور امید کے سوا اور کچھ نہ آسکا۔

صادق صابری صاحب کو ہمارے درمیان سے اٹھے ہوئے اور اس دنیا سے ناطہ توڑے ہوئے چند ماہ ہی گذرے ہیں اسی طرح قریبی وقت میں وہ اپنی بے پناہ تخلیقی قوتوں اور ملکہ کے ساتھ رخصت ہو گئے انہوں نے دیو بند کے مزاج اور عام روش سے ہٹ کر طنز و مزاح کے میدان کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے منتخب کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس انتخاب میں بیحد کامیاب رہے دیو بند کیا بلکہ قریبی شہروں اور اضلاع میں بھی کوئی ان کے مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکا اور اگر اس کو خوش گمانی یا غلط فہمی سے تعبیر نہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں کہ ان کا شمار پچھلے دور کے کچھ شعراء اور موجودہ دور کے چند شعراء میں بآسانی کیا جا سکتا ہے اور اگر مرحلہ موازنہ کا آجائے تو پھر وہ کئی ناموں پر بھاری پڑتے ہیں حالانکہ وہ نام اپنے دور کے معروف اور مقبول ناموں میں سے ہیں صادق صابری کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سمجھنے کے لئے پہلے اردو شاعری کے طنز و مزاح کے ذخیرے پر آپ کی نظر ہونی ضروری ہے پھر ان نزاکتوں اور بنیادوں کو بھی آپ سمجھتے ہوں جو اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی بنیاد و اور مزاج ہیں نثر میں آپ نے اگر فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، ملا رموزی، شوکت تھانوی، ابن انشاء جیسے لوگوں کو پڑھا ہے یا پھر قریبی دور میں رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے تو نثر میں لکھے گئے ان حضرات کے شہ پاروں کی خوبیوں، رفعتوں اور ادبی عظمتوں کا آپ اعتراف کریں گے اور آپ کا مکمل تاثر یہ ہوگا کہ ان حضرات نے طنز و مزاح کو باقاعدہ ایک فن بنایا اور انسانی زندگی کے نازک رشتوں کو ایک ایسی ڈور میں باندھنے میں کامیابی حاصل کی جہاں درد و غم اور رنج و الم کا کوئی گذر نہیں۔ حقائق ان کی تخلیقات کی جان ہیں اور سچائیوں کا اظہار ان کی اصل قوت طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں دلاور فگار، حاجی لق لق، بوم میرٹھی، ہلال رامپوری، ہلال سیوہاروی وغیرہ نے ایک زمانے تک مشاعروں کی دنیا میں قہقہوں کا طوفان برپا کیا ایک دور ایسا بھی گذرا کہ جب ان کی موجودگی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بن گئی حالانکہ ایسا کم ہوا مگر جب بھی ہوا بھرپور

طریقہ پر ہوا صادق صابری کو میں ان کی طنز و مزاح کی فطری قوتوں کے اظہار کے سبب بہت بلند مرتبے پر پاتا ہوں خداوند عالم نے اس فن پر ان کو جو عبور عطا کیا تھا وہ کم لوگوں ہی کے نصیب میں آتا ہے فارسی، اردو، انگریزی، اور ہندی الفاظ کے برمحل اور برجستہ استعمال پر ان کو جو قدرت حاصل تھی وہ تو واہ واہ کے درجہ میں تھی کس قدر قابو یافتہ تھے اور کتنا نکھرا ہوا انداز تھا یہ تو ان کا کلام پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے دیو بند کے حلقہ کے لئے انکا نام نیا اور نامانوس نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے انہوں نے وہ شہرت اور ناموری نہیں حاصل کی جس کے وہ ہر طور پر حق دار تھے مگر جیسا کہ میں نے لکھا وہ اپنی حدود، اپنی ذات اور اپنے دائروں میں رہ کر زندگی گذارنے کے عادی تھے اس لئے وہ سب کچھ نہ ہو سکا جو ہونا چاہیے تھا۔

میری بات اس وقت تک مکمل اور قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ میں صادق صابری کے ذخیرۂ اشعار میں سے چند نمونے آپ کی خدمت میں پیش نہ کر دوں۔

اب کہیں جا کر ملا ترکیب کے ہاتھوں سکوں
زندگی ہی میں بدل سکتا ہے انسان اپنی "جون"

اس نئے فیشن میں ہیں کمبخت کتنی کاوشیں
"بیک" دیکھو جان جاناں "فیس" دیکھو کارٹون

ان کو شکوہ ہے "پرسنل لاء" سے
جن پہ اطلاق ہی نہیں ہوتا

یہ ہے ایسا حساب نافہمی
جو کہ بے باق ہی نہیں ہوتا

کس قدر بوکس ہے وعدوں کی سیاست کا سفر
عیب آخر عیب ہے کتنا بھی کر لیجئے ہنر

روز بکھرے گی عمارت کھوکھلی بنیاد پر
آج ہریانہ کا چھپّر کل مرکز کے پلر

گرفتاری میں سو خطرے ہیں، مرڈر بے خطر کردو
ڈکیتی کا لگاؤ چارج اور انکاؤنٹر کردو

نیا قانون فیشن کی حفاظت کا بنایا کرو
کسی نیتا سے مت الجھیں شریفوں کو خبر کردو

انہوں نے لاتعداد قطعات کہے اور بے شمار نظمیں لکھیں، حالاتِ حاضرہ کے ہر پہلو اور ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ سماج میں جو کچھ ہو رہا ہے اور سیاست جس موڑ پر پہنچ چکی ہے ان سب چیزوں کو انہوں نے موضوعِ سخن بنایا ان کی نظموں میں ایک خاص رنگ اور ایک خاص انداز ہے ''خودکشی'' ''ٹھیکہ'' ''وقت کی آواز'' وغیرہ نظموں میں صادق صابری کا فن بولتا اور چٹکیاں لیتا ہے ''مانگ اور ٹانگ'' کے عنوان سے ان کی یہ نظم دیکھیں:

''مانگ'' ہو یا ''ٹانگ'' ہو دونوں میں خصوصی ربط ہے
مانگ کرنا حق بجانب، ٹانگ اڑانا ''ضبط'' ہے

ملک سے فرقہ فرستی دور ہو یہ مانگ ہے
اور پابندی لگے قرآن پر یہ ٹانگ ہے

مانگ سے گو مختلف ہے ٹانگ کا جغرافیہ
شاعری میں پھر بھی دونوں لفظ ہیں ہم قافیہ

مانگ کی اردو طلب ہے اور انگریزی ڈمانڈ
اس کی لاتعداد قسمیں بے شمار اس کے برانڈ

مانگ قانونی بھی، اخلاقی بھی انسانی بھی ہے
ٹانگ اڑانا دشمنی بھی، ضد بھی، شیطانی بھی ہے

ما نگ تاریخی نہ پوری کی تو افسانہ بنا
ٹا نگ اڑی تو بابری مسجد میں بت خانہ بنا

ما نگ لگتی ہے بھلی جس ما نگ میں سندور ہو
ٹا نگ اڑتی ہے وہی جس ٹا نگ میں ناسور ہو

کوڈ یکساں ہو سول کا ایک بہانا ہی تو ہے
پرسنل لا میں یہ اپنی ٹا نگ اڑانا ہی تو ہے

ذہن ہو گر صاف تب دل پر اثر کرتی ہے ما نگ
کھوٹ ہوتا ہے اگر دل میں تو اڑ جاتی ہے ٹا نگ

کوئی سنتا ہی نہیں میرٹھ کے مظلوموں کی ما نگ
اور لنکا میں زبردستی پھنسائی اپنی ٹا نگ

قتل و غارت میں ملوث کر کے اپنی ٹا نگ کو
بھر دیا سرکار نے جمہوریت کی ما نگ کو

ہر ریاست میں ہے خود مختار ہو جانے کی ما نگ
یہ گورنر گویا ہر صوبے میں ہیں مرکز کی ٹا نگ

انقلاب آئے نہ آئے شر پہ مبنی ما نگ سے
چل نہیں سکتی کوئی بھی مملکت ایک ٹا نگ سے

قبل از شادی تو پوری کیجئے دلہا کی ما نگ
بعد میں اکثر سسر اور ساس کی اڑتی ہے ٹا نگ

زندگی پیاری ہے بیٹی کی تو ما نگیں مانئے
ٹا نگ دیں گے چھت کے پنکھے پر اسے سچ جانئے

ما نگ ہو جس آئٹم کی وہ ضرورت ہی تو ہے
ٹا نگ اڑانے کا سبب دل میں کدورت ہی تو ہے

ہوٹلوں کا کیجیے سروے کہ ہے کس ڈش کی مانگ
سب طلب کرتے ملینگے آپکو "مرغے کی ٹانگ"

مفسدوں کی جتنی مانگیں سب حقائق کے خلاف
کر نہیں سکتی کبھی تاریخ ظالم کو معاف

ہسٹری میں ٹانگ مارو...... ابا جی کا راج ہے
کل کو اس موسم کی گارنٹی نہیں جو آج ہے

شاہجہاں نے کب بنایا آگرے کے تاج کو
اسکا تو سارا کریڈٹ ہے پرتھوی راج کو

میٹ بکنا بند...... ہو یہ مانگ ہے کتنی نفیس
اور خود ہوٹل میں چھپ کر نوچتے ہیں لیگ پیس

ورنہ ان آلو مٹر والوں کو اس کی فکر کیا
آدمی کھاتا نہیں جو چیز اس کا ذکر کیا؟

عقل خود حیران ہے یہ لوگ انساں ہیں کہ ڈھور؟
آدمی ''ہتیا'' پہ خوش ہیں ''جانور ہتیا'' پہ شور؟

صفحات کی تنگ دامنی اجازت نہیں دیتی ورنہ انکی ایک اور معرکہ آرا نظم ''غیر ملکی ہاتھ'' بھی یہاں پیش کرنے کو دل چاہتا تھا۔ بہر حال ان کے ان اشعار میں کس قدر سلاست اور روانی ہے مضمون کو باندھنے اور موضوع کو ابھارنے کا جو ثبوت انہوں نے دیا وہ اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ طنز و مزاح انکا مخصوص میدان تھا اور اس میدان میں خداداد صلاحیتوں نے ان کی بھرپور رہنمائی کی ان کی نظمیں قاری اور سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا جب بوریت اور اکتاہٹ کی کیفیت پیدا ہو، پھوہڑ اور رکیک شاعری سے وہ کوسوں دور رہے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ انہوں نے شاعری کی، کہیں جھول نہیں، کہیں نقص نہیں نہ کسی جگہ بھرتی کی چیزیں

رواں دواں انداز، سہل لب ولہجہ، آسان زبان، بات کی ادائیگی کا سلیقہ اور شگفتہ گوئی ان سب نے انکو بلندیاں عطا کیں، عروج بخشا اور مقبولیت کی کئی منزلیں انہوں نے طے کیں۔

صادق صابری نے اپنے فطری ذوق اور طبعی میلان سے ہٹ کر بھی شاعری کی سہرے لکھے، رخصتیاں بھی کہیں اور نعت وسلام سے بھی خود کو محروم نہیں رکھا ان کی نعتوں کی کافی تعداد ہے ٹی سیریز والوں نے ان کی نعتوں کے کئی کیسیٹ تیار کئے جو بازار میں پہنچ کر خوب سنے گئے اور خوب مقبول ہوئے انکی نعت گوئی میں وہی جذب و کیفیت، وہی محبت و عقیدت، وہی وارفتگی اور شوق ہے جو نعت گوئی کا اصل سرمایہ ہے۔ایک صاحب ایمان کو جو تعلق اور عشق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ہو سکتا ہے۔اس کا مظہر ان کی نعتیں ہیں ایمانی جذبے اور تقاضے کے تحت یہ نعتیں کہی گئیں ہیں ایک ایک مصرعہ اور شعر میں الفت اور احترام کا دریا موجزن نظر آتا ہے۔ایک غلام، ایک صحیح العقیدہ مسلمان، ایک سلیم الطبع اور سلیم الفکر انسان ہی اس دشوار گذار اور نازک مرحلہ سے آسانی کے ساتھ گذر سکتا ہے۔صادق صابری نے بھی اس دشوار راستے پر پوری احتیاط کا مظاہرہ کیا نہ کہیں لغزش کھائی، نہ کہیں بھٹکے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام، تقدس اور مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے کامیاب نعت گوئی کے نمونے پیش کئے ان کی یہ نعت دیکھئے۔

ثانی تیرا کوئی نہیں اوجِ فلک تا سرزمین
اے رحمت للعالمین محبوب رب العالمین
تو ابتدا تو انتہا تیرے لئے ارض و سماء
شہرت ہے تیری ہر جگہ ہر لب پہ ہے چرچا ترا
تو حق نما قبلہ نما جلوہ فگن جلوہ نما
تو دین دکھیوں کی دعا تو بیکسوں کا آسرا

رحمت تری فرش زمیں عظمت تری عرش بریں
اے رحمت للعالمین محبوب رب العالمیں
پربت ترے غاروں میں تو صحرا میں کہساروں میں تو
زمزم کے ان دھاروں میں تو چندا میں تو تاروں میں تو
قرآن کے پاروں میں تو رحمان کے پیاروں میں تو
گل کی طرح خاروں میں تو امت کے غمخواروں میں تو
پیغام تیرا دلنشیں جس کو فنا ہرگز نہیں
اے رحمت للعالمین محبوب رب العالمیں
کونین میں سطوت تری معراج میں عظمت تری
خالق سے ہے نسبت تری مخلوق پر رحمت تری
بے لوث ہے خدمت تری بے خوف ہے ہجرت تری
ہر دل میں ہے الفت تری فتح تری نصرت تری
جاگیر تیری یہ زمیں تو عرش اعظم کا مکیں
اے رحمت للعالمین محبوب رب العالمیں
تیری نواحق کی نوا تیرے لئے کعبہ بنا
تو مظہر ذات خدا سب سے بڑا سب سے جدا
اے پیکر صدق و صفا اے خوگر صبرو رضا
معصوم ہے تو پارسا اے مصطفیٰ اے مجتبیٰ
صادقؔ بھی ہے تیرا گدا در پر ترے اس کی جبیں
اے رحمت للعالمین محبوب رب العالمیں

صادقؔ صابری کی شروعات بڑی دھماکہ خیز تھی اور ان کی آمد طنز و مزاح کی دنیا میں ایک ایسے فرد کی آمد کا اعلان تھی جس کو آگے اور بہت آگے بڑھنا تھا مگر معلوم

نہیں وہ کہاں گم ہو گئے۔ راہ ان کی آسان تھی مواقع بھی ان کو خوب حاصل تھے مگر اپنی افتادِ طبع سے مجبور صادقؔ صابری نے کسی مصلحت سے سمجھوتہ نہیں کیا پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا اور جو ہمیشہ سے ہو رہا ہے ۶۰/۶۵ سال کی عمر میں ۵/مئی ۲۰۰۲ء کو وہ زندگی سے ناطہ توڑ کر موت سے ہم کنار ہو گئے ان کی شاعری کانوں کے ذریعہ پہلے دل میں اترتی پھر دماغ پر قبضہ جماتی اور آخر میں روح کی گہرائیوں میں اتر کر قہقہوں کے چشمے کی صورت میں ابل پڑتی ہے۔ صادقؔ صابری کا وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور تھا ابتداء میں ہی انہوں نے دیوبند میں سکونت اختیار کر لی اس طرح وہ دیوبندی ہو کر طنز و مزاح کی دنیا میں دیوبند کے واحد ترجمان بن کر سامنے آئے اور انہوں نے اس ترجمانی کا خوب حق ادا کیا۔

❁ ❁ ❁

ساحؔل فریدی

مرزا محمد احمد ساحل فریدی مرحوم راہی ملک بقا ہو گئے کامیابی کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے لیے انہوں نے بے حد محنت کی تھی اور گزشتہ چند سالوں میں وہ شہر سہارنپور؛ بلکہ ضلع کی نمائندگی دور دور تک کر رہے تھے، ان کے اس طرح اچانک چلے جانے سے نہ صرف چراغ فکر وفن بجھا بلکہ ادبی راہیں کچھ دیر کے لیے سہی سونی ہو گئیں وہ لہجہ اور ترنم کہیں کھو گیا جو ساحل فریدی کے نام سے زندہ اور اس کی شخصیت کا حصہ تھا ساحل نے پوری زندگی جد وجہد کی اور طویل عرصہ کے بعد سہارنپور سے ایک ایسی معتبر آواز کے روپ میں سامنے آئے جس سے پچھلوں اور چند موجود لوگوں کی شخصیت اور شاعری کو جلا ملی، وہ ادبی نزاکتوں اور اس راہ کے رموز سے آشنا اور ادبی رجحانات اور تقاضوں سے نہ صرف واقف، بلکہ ان کے برتنے کے ہنر اور فن پر بھی قادر تھے۔

• ساحل صاحب کو خدا نے بیشمار خصوصیات سے نوازا تھا سہل اور آسان زبان میں گفتگو، تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں پختگی، درد اور غم کے بیان میں مہارت، سماجی اور معاشرتی رشتوں پر نگاہ، انسانی کرب اور الم کی داستان، بکھرتے ٹوٹتے احساسات کی ترجمانی، مانوس لب ولہجہ، نازک تعبیرات اور تاریخی حوالوں سے ان کی شاعری کی شناخت قائم ہوئی، یہ شناخت ساحل کے اندر چھپے انسان کا پتہ دیتی ہے، ایک ایسا انسان جس کی روح نظیف اور جس کے خیالات صاف وشفاف تھے، سادہ اور سلیس اشعار میں ان حقیقتوں کا اظہار ہوتا، جن سے آج

کا انسان دو چار ہے ان کی نظر افق تا افق ان مناظر کو سمیٹ لینے میں کامیابی حاصل کر لیتی تھی، جو کبھی ماضی کا حصہ ہوتے ہیں، کبھی حال کا بیان بن جاتے ہیں اور کسی لمحہ مستقبل سے ان کا رشتہ جڑ جاتا ہے، مشاہدہ کی قوت ان کی رہنمائی کرتی اور تجربہ کی دھیمی دھیمی آنچ سے بات باوزن اور باوقار ہوتی ان کی ادبی حیثیت اور مقام کا تعین تو اہلِ نظر اور اصحابِ فن ہی کر سکتے ہیں، مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ان کا یہ سفر کامیاب سفر تھا اور بیشمار مشاعرے ان کے حوالے سے کامیاب مشاعرے ہو گئے، ان کی آمد سے بیجان اسٹیج رونق پاتا اور ان کے منفرد ترنم سے مشاعرے میں جان پڑ جاتی۔

ساحل صاحب سے میری جان پہچان اور تعلق کو صرف پانچ سال ہی میسر آ سکے ان پانچ سالوں میں بہت قریب سے میں نے ان کو دیکھا بحیثیت شاعر تو میں ان کے بارے میں لکھ چکا، بحیثیت انسان بھی ان کا مرتبہ بلند ہے، نہایت خوش اخلاق، خوش خصال اور خوش مزاج انسان تھے ان کے چہرے اور گفتگو سے درد وغم اور رنج وملال کی کسی کیفیت کا اندازہ لگا لینا، محرومیوں اور مایوسیوں کی کوئی کہانی پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لینا ناممکن تھا۔ شاداب چہرہ، ہونٹوں پر مسکراہٹ، باتوں میں شوخی اور ایک ایک جملہ میں قہقہوں کا طوفان ہوتا، محفل زعفران زار بنجاتی، شاگردوں کی تو خوب خبر لیتے، مگر اگلے ہی لمحے دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے دکھائی دیتے۔ ادبی نشستیں ہوں یا آل انڈیا مشاعرے چھا جاتے اور مسلسل سنتے رہیں اس کا احساس چھوڑنے میں کامیاب رہتے، نامانوس اور مشکل تراکیب سے دامن بچاتے عوامی زبان میں عوام کے لیے ہی کہتے ہاں ادبی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کرتے، خودستائی سے انہیں مناسبت نہ تھی اور نہ ہمچوں من دیگرے نیست کے مرض میں مبتلا تھے، شعراء کا بڑا طبقہ کیا اکثر طبقہ اس لاعلاج بیماری کا شکار ہے، ساحل صاحب کی فطرت میں یہ چیزیں شامل ہی نہ تھیں، اپنے بڑوں کا احترام کرتے، معاصرین کے ساتھ عزت سے پیش آتے اور تلامذہ کے حق میں مشفق اور مہربان تھے۔

انسانی درد و غم کے اظہار کی قدرت حاصل تھی، زندگی کے نشیب و فراز، بنتے بگڑتے رشتوں اور بکھرتی روایتوں کا کرب ان کے اشعار میں بھر پور طریقے پر موجود ہے، وہ شاعری جو روح اور جسم کے رشتوں کو ایک ڈور میں باندھے رکھتی ہے، ساحل کی شاعری وہی شاعری تھی اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبری کو وہ ایک ناقابل معافی جرم خیال کرتے تھے، موجودہ وقت میں زندہ رہنے کا جو فن ہے اس کے قریب سے بھی ساحل صاحب کا گذر نہیں ہوا تھا، اپنی محنت، اپنی جد و جہد اور اپنی کوششوں سے انہوں نے یہ مقام بنایا تھا، اگر وہی حربے اختیار کرتے جو ان کے معاصر شعراء نے اختیار کئے تو ان کی کامیابیوں کا سفر کئی دہائیوں پہلے شروع ہو چکا ہوتا، یہاں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کے عروج کی کئی دہائیاں گذر چکی ہوتیں مگر ساحل نے ساحل کی تلاش میں گھٹنوں کے بل بیٹھنا نہیں سیکھا تھا، ان کے فکر و فن کی ہر موج ساحل سے ٹکراتی اور وسیع سمندر کا حصہ بن جاتی۔

گذشتہ کئی سال سے شوگر نے ان کو بالکل گھلا دیا تھا، دن بہ دن کمزور سے کمزور ہوتے گئے اور آخری مرض جو انہیں راہیٔ ملک عدم بنا گیا وہ ہڈی کا کینسر تھا، جس نے ان کی تمام توانائیاں چھین لیں، رمضان کے مہینے میں مجھے ان کی شدید علالت کی اطلاع ملی، عید کے چند روز بعد نکھرتے ابھرتے اور ان کے شاگردِ خاص اور معتمد جناب شمیم مضطر دیوبندی کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا، انتہائی کرب و بے چینی اور اضطراب کے عالم میں انہوں نے میری خیریت پوچھی اب وہ ہڈیوں کا ڈھیر تھے، زندگی کی کوئی رمق ان میں دکھائی نہ دی، وہ اس تیر کی طرح تھے جو اپنی کمان سے نکل چکا ہو، اس ملاقات میں ایک لمحہ وہ بھی آیا جب انتہائی درد کے عالم میں وہ بلند آواز سے چیخے، شاہ صاحب قریب آؤ، سورۂ یٰسین پڑھو اس سے پہلے کہ میں ان کے اور قریب ہوتا انہوں نے خود ہی سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی، پوری سورت پڑھنے کے بعد نڈھال ہو کر پڑ گئے اس طرح کہ جیسے اب اٹھنے

کا ارادہ ہی نہ ہو، چند گھنٹوں کی یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی، طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اہل خانہ ان کو بغرضِ علاج دہلی لے گئے، صحت ان کی سہارنپور میں ختم ہو چکی تھی زندگی ان کی دہلی میں پوری ہوگئی، سہارنپور آخر لمحوں میں لائے گئے اور ۲۴ رگھنٹے بعد خود اپنے اس شعر کا مصداق بن گئے:

سفر تمام ہوا غسل دے رہے ہیں لوگ
بدن سے گردِ مسافت اتارنے کے لئے

ان کا ذخیرۂ شاعری ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے، میں زندگی میں ان سے کہتا تھا کہ اپنا مجموعہ کلام شائع کر دیجئے۔ ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ مجموعۂ کلام کا ارادہ کر چکا ہوں اور نام ''دھول کا پیرہن'' تجویز کیا ہے، مجموعۂ کلام تو نہ آسکا ہاں وہ خاک کا پیرہن اوڑھے ابدی نیند سوتے ہیں، ان کے چند اشعار اور ایک غزل نذر قارئین ہیں کہ ان کے اشعار ہر دل کی آواز اور ان کی شاعری ہماری ادبی روایتوں کی ایک معتبر کڑی ہے:

سورج لہولہان ہے ہر شام دیکھ لے
اے زندگی غرور کا انجام دیکھ لے

نئے چراغ جلانا تو ایک بہانا ہے
ہمیں تو زور ہواؤں کا آزمانا ہے

تم اپنے واسطے سایہ تلاش کر لینا
ہمارا دھوپ سے رشتہ بہت پرانا ہے

مسئلے ہوتے ہیں ہر شخص کے اپنے اپنے
کون ایسا ہے جو حالات سے دو چار نہیں

زندگی حشر خدا جانے تیرا کیا ہوگا
سیکڑوں غم تیرے دامن میں ہیں دو چار نہیں

مروتوں کا زمانہ گذر گیا شاید
وہ آنکھ آنکھ جو پانی تھا مرگیا شاید

بڑے تپاک سے وہ آج مسکرا کے ملا
خمار اس کی انا کا اتر گیا شاید

پھر اس کے شہر میں جانے کی دُھن سوار ہوئی
پھر ایک سفر وہ میرے نام کر گیا شاید

بہت دنوں سے کوئی خیریت دعا نہ سلام
میں اس کے ذہن سے بالکل اتر گیا شاید

گئی رتوں کے تقاضے وہی پرانے ہیں
نئی رتوں کا ہر ایک زخم بھر گیا شاید

یہ کس نے شہر میں ویرانیاں بچھادی ہیں
سکوت ایسا کہ ہر لفظ مرگیا شاید

نہیں نہیں یہ مرا عکس ہو نہیں سکتا
اس آئینے ہی کا پانی اتر گیا شاید

خموش بیٹھے ہیں کچھ لوگ اداسیاں اوڑھے
گذرنے والا وہ لمحہ گذر گیا شاید

نعتیں بھی انہوں نے خوب کہیں اور ایک مجموعہ کی صورت میں نعتوں کا انتخاب بھی کر چکے تھے، اس المناک صورت میں جب کہ ان کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے ان کی کسی تخلیق کی فرمائش کرنا ممکن نہ تھا اور جب فرمائش کی تو زیادہ دلجمعی سے

برادرم شعور اسلم ساحلؔ صاحب یہ کام نہ کر سکے، تبرک کے طور پر ان کی نعت پیش ہے:

میری نظر ہے طالبِ دیدار یا نبیؐ
آجائیے گا خواب میں ایک بار یا نبیؐ

پرسانِ حال کوئی نہیں آپ کے سوا
تکتے ہیں راہ بیکس و لاچار یا نبیؐ

محشر میں ہو رہا ہے شفاعت کا انتظار
نادم کھڑے ہوئے ہیں گنہگار یا نبیؐ

صلّے علیٰ کا ورد کریں دل کی دھڑکنیں
بھیجوں درود پاک لگاتار یا نبیؐ

طوفان اٹھتے رہتے ہیں ساحلؔ کے آس پاس
کشتی کے تھام لیجئے پتوار یا نبیؐ

دبستانِ انور صابری دیوبند نے تین سال قبل ان کے اعزاز میں ''ایک شام ساحل فریدی کے نام'' کا انعقاد کیا تھا، یہ شام یادگار شام ثابت ہوئی، آخر میں ساحل صاحب نے بھی خوب پڑھا بار بار ان سے فرمائش کی گئی اور انہوں نے کسی کو مایوس نہیں کیا، جب وہ اپنی ایک غزل پڑھ رہے تھے نہ معلوم بات کہاں پہنچی یا ان کے ذہن میں کیا بات آئی کہ انہوں نے کہا:

موت برحق ہے آئے گی ایک دن ضرور آئے گی

کیا معلوم تھا کہ ساحل صاحب اتنی جلدی اس حقیقت کا حصہ بن جائیں گے، موت آئی اور انہیں ہمارے درمیان سے اٹھا کر لے گئی، انہوں نے دیوبند ہی میں سنایا تھا کہ:

آج ادھوری چھوڑ آیا ہوں میں جس کو
کل وہ کہانی پوری بھی ہو سکتی ہے

ساحل صاحب کی وہ کہانی ادھوری ہی رہ گئی ۱۳؍اگست ۱۹۴۲ء کو ان کی زندگی کا سفر شروع ہوا اور ۲۰؍دسمبر ۲۰۰۳ء کو وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے، وہ ہی منزل جو ہم سب کی بھی آخری منزل ہے انہوں نے کہا تھا کہ:

جن کو مری نگاہ کی گرمی نصیب تھی
آواز دے رہے ہیں وہی بام و در مجھے

وہ گلیاں، وہ کوچے، وہ بام و در، وہ گھر، وہ شہر جو آپ سے مانوس تھے اور آپ سے محبت کرتے تھے اور وہ لوگ جو آپ کے مداح تھے وہ ہمیشہ آپ کو آوازیں دیں گے، آپ کو یاد کریں گے، مگر آپ کے کہنے کے مطابق اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا:

جانے والا جا چکے گا نقشِ پا رہ جائے گا
اور تو اس نقشِ پا کو دیکھتا رہ جائے گا

❁ ❁ ❁

اور کچھ لوگ یہ بھی!

اس کتاب میں شامل اپنے تمام مضامین میں یہ بات میں نے ہر جگہ لکھی ہے کہ دیوبند ایسی بستی ہے جہاں صلاحیت مند لوگوں کی کمی نہیں، اس مجموعۂ مضامین میں جن افراد کا انتخاب کیا گیا ہے، ان سے کہیں زیادہ ایسے ہیں کہ جن کے ذکر کے بغیر بات مکمل ہو ہی نہیں سکتی، ان کے علمی، ادبی، شعری، فکری اور صحافتی کام اس درجہ کے ہیں کہ آنکھیں بند کرنے سے نہ وہ اوجھل ہو سکتے اور نہ ان کو چھوڑ کر آگے بڑھنا ممکن ہے، کتاب کی ضخامت جتنا بھی موقع دے رہی ہے اتنے پر ہی میں اکتفا کر رہا ہوں امید ہے کہ نہ کوئی شاکی ہوگا اور نہ کوئی معترض یہ سب میرے بڑے ہیں، ہوسکتا ہے میرے اس مضمون کا عنوان میری اگلی کتاب کا نام بن جائے۔ بارگاہ ذوالجلال میں یہی میری دعا ہے، یہی میری آرزو اور یہی میرا ارادہ۔

مرحومین میں حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کی شخصیت ایک جاذب شخصیت تھی وہ دارالعلوم کی تدریسی زندگی کا ایک ستون تھے حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی علمی شخصیت ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے، مولانا سید اختر حسین میاں صاحب ناظم تعلیمات کا معصوم چہرہ آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے، مولانا عبدالاحد صاحب اپنے مخصوص انداز درس کی بنا پر متعارف رہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی جرأت و بے باکی اور مثالی استقامت کا ذکر بھی

ضروری تھا، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا منظور نعمانی اپنی تحریری خصوصیات اور تصنیف وتالیف کی بنیاد پر اس کتاب کا حصہ بننا چاہئیں تھے مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی کی تصنیفی خدمات بھی قابل ذکر ہیں، ایسے ہی مولانا محمد عثمان صاحب نواسۂ شیخ الہند، مولانا محمد ہارون صاحب نواسۂ شیخ الہند، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا فیض الحسن صاحب کشمیری، مولانا حامد میاں صاحب، مولانا بہاؤ الحسن صاحب، حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحب، مولانا زبیر صاحب، مولانا شاہد صاحب، حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ، حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ وغیرہ ان سربرآوردہ لوگوں میں سے ہیں جن سے دیوبند نے روشنی پائی اور جو آسمان علم پر نجوم و کواکب کی طرح اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

دیوبند اپنی علمی تاریخ کے جس پڑاؤ پر آج ہے وہاں ان مرحومین کا تذکرہ اگر نہ ہو یا انکو یاد نہ کیا جائے تو اسے ہم دیانت دارانہ عمل سے تعبیر نہیں کرسکتے، یہ سب محسن ہیں اور ان کے احسان کو آنے والا وقت ضرور محسوس کرے گا، اور یقین ہے کہ بعد کے لوگ ان کے ذکر خیر کو اپنے لیے سعادت تصور کریں گے۔

ادب وصحافت اور شعروفکر کے حوالے سے بھی چند نام ناقابل فراموش ہیں، اپنے اپنے وقت میں ان لوگوں نے اپنے فکر پاروں، اپنی توانائیوں اور فکری جولانیوں سے دیوبند کی ادبی زندگی کو حیات دوام بخشی، سید زاہد قیصر مرحوم، مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، مدیر پندرہ روزہ استقلال دیوبند، عقیل مجزوں زبیر افضل عثمانی، مستحسن فاروقی، ماسٹر ظفر کالو، جناب مسعود جاوید صاحب بی اے، جناب شمس نوید عثمانی صاحب وغیرہ کی حیثیت کو نہ بھلایا جاسکتا اور نہ جن کے بارے میں سرسری گفتگو کر کے دل کو تسلی دی جاسکتی ہے گذرنے والے سبھی ایک تاریخ ہیں، ایک عنوان ہیں، ایک دور ہیں، ایک زمانہ ہیں، نہ ان کے دور کو الفاظ میں قید کیا جاسکتا اور نہ ان کے زمانے کو حرف ومعانی کا لباس پہنا کر مطمئن ہوا جاسکتا ہے مگر کیا کروں

کتاب کے محدود صفحات آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔

موجودین میں عمر فاروق عاصم ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، عظیم خاندانی نسبتوں کے حامل ہیں، تاجدار تاج کے دو مجموعۂ کلام ''زبر'' اور ''آوارہ پتھر'' قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں وہ منفرد طرز اور فکر کے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے بمبئی جیسے شہر میں دیوبند کی ادبی روایتوں کا نام روشن کیا ہے، دیوبند ان کا وطن ہے جس سے ان کا اٹوٹ رشتہ ہے اور بمبئی ان کی قیام گاہ۔ کامیاب فلمی نغمہ نگاری کا دور گذار کر اس راہ کی ناہمواریوں سے پیچھا چھڑا کر خالص تخلیقی عمل میں مصروف ہیں اور اب ان کے صبح وشام ادبی نگینوں کی تراش خراش میں گذر رہے ہیں۔

جناب عثمان شاکر، جناب شمیم اکبرآبادی، جناب شمیم انصاری، جناب عمر دراز خاں عمر، قدیم روایتوں کی اس شاعری کے تاجدار ہیں جن سے دیوبند کے شعری آنگن میں رونق ہے گرمی ہے اور حرارت ہے، جناب شمیم مضطرؔ، جہاز دیوبندی، شمیم کرت پوری ان شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کا الگ رنگ ہے اور فکر کی پختگی جن کا امتیاز ہے جہاز طنز ومزاح کے اسٹیج پر صادق صابری کے بعد دیوبند کی نمائندگی کر رہے ہیں ڈاکٹر شمیم دیوبندی ایک کامیاب معالج، ایک ایثار پیشہ شخص، ایک بلند اخلاق انسان اور دیوبند کی شعری روایتوں کو زندگی کی سچائیوں اور حقائق سے روشناس کرانے کا کام انجام دے رہے ہیں، شمیم مضطرؔ کے سلسلہ میں یہ بات رہی جاتی ہے کہ وہ اپنے استاذ ساحل فریدی کے فکر وفن کے صحیح جانشین اور سچے عاشق ہیں، اسلامی اقدار اور مشرقی تہذیب ان کی شعر گوئی کا جزء لاینفک ہیں، خوب کہتے ہیں اور بھرپور کہتے ہیں، عبداللہ راہیؔ اس دور سے شاعری کر رہے ہیں جب نواز اور ماجد شاعری کی دہلیز پر کھڑے اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوششوں میں مصروف تھے، آواز ان کی خوبصورت، ترنم خوبصورت، شاعری خوبصورت، بیشمار آل انڈیا مشاعرے پڑھے تیز گامی کے ساتھ شعری سفر شروع کیا، مگر نا معلوم وہ کیا اسباب رہے کہ راہیؔ پیچھے ہی ہٹتے چلے گئے۔

نواز دیو بندی اور ماجد دیو بندی سے کون واقف نہیں آج ہندوستان او
ہندوستان سے باہر ہر اردو داں ان کی شاعری کا عاشق اور مداح ہے، دونوں کے مجموعۂ کلام
ارباب ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، انور صابری کے بعد ان دونوں نے
مشاعروں کے اسٹیج پر دیو بند کے نام کو زندہ اور باقی رکھا۔

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیو بند، حضرت
مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند، حضرت مولانا سید جلیل حسین
میاں صاحب، حضرت مولانا سید خلیل حسین میاں صاحب، مولانا محمد اسلم صاحب
قاسمی، مولانا عبداللہ جاوید صاحب، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری،
مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی، مولانا ریاست علی صاحب قاسمی، مولانا نور عالم خلیل امینی
مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، قاری رفعت صاحب، مولانا مفتی ظفیر الدین
صاحب، مولانا قاری ابوالحسن صاحب، جناب اشرف عثمانی، جناب اسلم انصاری،
مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی، جناب مسعود عثمانی صاحب وہ ممتاز ترین نام ہیں جو
درس و تدریس، تقریر و خطابت، تصنیف و تالیف، شعر و فکر اور ادب و صحافت کی وادیوں
میں اپنے نقوش قدم سے دیو بندیت کی آبرو کو باقی رکھے ہوئے ہیں وہ دیو بندیت جو
صحیح فکر اور صحیح عقیدے سے مرکب ہو کر اپنی الگ شناخت اور پہچان رکھتی ہے۔

جناب مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی استاذ حدیث و ادب دارالعلوم وقف
دیو بند نہ صرف کامیاب مدرس بلکہ صاحب قلم شخصیت کے مالک ہیں، انشاء و ادب اور
تحریر و صحافت کی ان روایتوں کی پاسداری کا عمل انجام دے رہے ہیں جو قاسمی برادری کا
ہمیشہ امتیاز رہی ہیں، کئی کتابوں کے شارح، مصنف و مؤلف ہیں، کئی سال اپنی ذاتی
عربی پرچہ "الثقافۃ" کے نام سے نکال کر عربی داں حلقوں میں بھی عزت و قدر کی نگاہ
سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا کفیل احمد علوی، جناب عادل صدیقی، جناب اظہر صدیقی، جناب سید

زاہد حسین، جناب حامد تحسین ،مولانا اعجاز احمد قاسمی،مولانا شاہین جمالی، مولانا عبدالرشید بستوی، ڈاکٹر عبید اقبال عاصم قاسمی،مولانا صغیر احمد پرتاپ گڑھی، مفتی خورشید صاحب،مولانا اعجاز ارشد قاسمی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے ادبی وصحافتی کاموں کا احاطہ ممکن نہیں، کفیل احمد صاحب علوی اچھا لکھتے ہیں اچھا کہتے ہیں، عادل صدیقی کے فکری شہ پارے روزاخبارات کی زینت بنتے ہیں،ان کی قلمی خدمات کا دائرہ بیحد وسیع ہے ہر موضوع پر کامل طبع آزمائی کے بے شمار نمونے ہمارے سامنے ہیں،مولانا شاہین جمالی جملہ اصناف سخن سے لے کر تحریر وصحافت کے ہر رنگ میں لکھنے کے ماہر،منفرد انشاء پرداز وصاحب طرز ادیب ہیں،ان کی نثر پڑھئے تب،شاعری کا مطالعہ کیجئے تب یا ان کی تقریر سنیے تب، شاہین جمالی کی انفرادیت ہر جگہ بولتی نظر آئے گی۔ جناب اظہر صدیقی اور جناب سید زاہد حسین ہمارے ان پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں جو اس راہ پر خار کی ہر وادی سے گذرے اور فکر وفن ۔کے وہ چراغ روشن کئے جو ہم جیسے چھوٹوں کے لئے ہمت وحوصلے کا سبب بنتے ہیں، اظہر صاحب کا اپنا رنگ ہے تو زاہد صاحب کا اپنا الگ انداز۔

مولانا سید عبدالرؤف صاحب عالی کو قدرت نے وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ فکر وفن کی بے پناہ صلاحیتوں اور دولتوں سے نوازا ہے،ان کی تحریریں ہمارے حلقے کے ان لوگوں کی تحریروں میں شمار کی جاتی ہیں جہاں فکر ہے، آمد ہے، فکری توانائیاں ہیں، سچائیوں کا بیان ہے اور تحریری نزاکتوں کا حسن ہے۔

جناب حامد تحسین صاحب لکھتے کیا ہیں نثر میں شاعری کرتے ہیں دیوبند میں ابوالکلام کی نثر کی خوشبو اور مہک ان کے بے پناہ مقالات ومضامین میں محسوس کی جاسکتی ہے، خلیق، ملنسار، مشفق ومہربان ہر شخص کے ساتھی اور ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والے ، اپنی تحریر کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ان کے بعد ان جیسی تحریروں کا سلسلہ قائم رہے یہ ممکن نظر نہیں آتا۔

جناب ڈاکٹر عبید اقبال عاصم میرے دوست اور میرے ساتھی مگر مجھ پر ہر طرح فائق اور بلند، بے حد مستعد اور فعال، تحریریں فکر انگیز، اسلوب کی خوبصورتی، بیان کی ندرت، زبان کی حلاوت، قلم کی شیرینی اور تحریر کی باریکی سے ان کے مضامین مزین ہوتے ہیں جو اس عمر میں کم لوگوں کا نصیب بنتی ہیں۔

جناب مولانا حسن احمد صدیقی، مولانا ندیم الواجدی، سید عقیل حسین میاں صاحب، اطہر عثمانی مدیر ''عقائد'' کا نام اگر کوئی بھولتا ہے تو دیوبند کی تاریخ ادب وصحافت میں ان ناموں کو فراموش کرنے کا نا قابل معافی جرم کرے گا، جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

مولانا حسن الہاشمی ماہنامہ تجلی سے لے کر شریک حیات اور طلسماتی دنیا تک اتنا لمبا تحریری سفر طے کر چکے ہیں اور قلم کی روانی، تحریر کی بلندی اور فکر کی گہرائی کے وہ نمونے پیش کر چکے ہیں کہ کسی تعریف وتوصیف کے خانے میں ان کو قید نہیں کیا جا سکتا قلم کے دھنی، دھن کے پکے جس جانب چلے کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔

مولانا ندیم الواجدی صرف احیاء العلوم کے مترجم نہیں یا صرف معلم العربیہ اور عربی میں ترجمہ کیجئے کے مؤلف نہیں بلکہ گذشتہ ۳۵ سال میں دیوبند کی ادبی وصحافتی زندگی کا اعتبار ہیں، ان کے قیمتی، گراں قدر اور انتہائی علمی مضامین سے ہزاروں اخبارات ورسائل استفادہ کر چکے ہیں، اپنے ہم عمروں میں ان جیسا لکھنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو، ان کے قلم سے نکلی ہر تحریر ہم جیسے خردوں کے لئے ایک سبق بنکر سامنے آکھڑی ہوتی ہے، ان کی تحریروں میں کیا کچھ نہیں ہے بلند انشاء، اچھوتا اسلوب، بیان کی پختگی، زبان کی سلاست، ہر چیز وافر مقدار میں موجود ہے۔

انجم عثمانی، افسانہ نگاری میں اپنی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور موجودہ دور کے جو افسانہ نگار ہیں ان میں ان کا قد بے حد بلند ہے شب آشنا، ان کا پہلا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا تب سے آج تک انکا افسانوی سفر اردو کے مؤقر ادبی جرائد ورسائل

میں جاری ہے۔ سفر در سفر، ٹھہرے ہوئے لوگ ان کے دیگر افسانوی مجموعے ہیں۔

برادرم سید وجاہت شاہ انور نے بچپن ہی میں کاغذ و قلم سنبھال لیا گھریلو اثرات کے تحت اردو ان کے خیالات کا مرکز بنی اچھا لکھتے ہیں عمر کی چند منزلیں اور طے کرنے کے بعد ہندی زبان کو انہوں نے اپنے فکر کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ہے حال ہی میں ان کی کتاب ''دیو بند گورو'' منظر عام پر آئی ہے۔

ہوسکتا ہے ''اور کچھ لوگ یہ بھی'' میں کچھ لوگوں کا نام چھوٹ گیا ہو یا کچھ لوگ بر وقت میرے ذہن میں نہ آسکے ہوں وہ سب اس مضمون کا حصہ ہیں اور ان کی خدمات بھی اس درجہ کی ہیں کہ ان کا تذکرہ ہو، ان کو بیان کیا جائے اور ان کے بارے میں بھی مفصل گفتگو ہو۔

❁ ❁ ❁

میرے عہد کے لوگ

پر

قلبی تاثرات

سادہ خاکوں میں حسیں رنگ کے منظر کتنے
رکھ لئے فکر کے کوزے میں سمندر کتنے
کس سلیقہ سے کئے نذر عقیدت کے گلاب
اور شاداب ہوئے حسنِ حقیقت کے گلاب
جسم تحریر نے الطاف کی قربت پائی
لفظ مضمون میں ڈھلے نکہتِ طیّب آئی
صبحِ انوؔر کی طرح نور بداماں آئے
قافلے ذکر کے خود مثلِ بہاراں آئے
عہدِ حاضر کے مشاہیر کی تاثیر بھی دیکھ
دستِ ناقد میں پڑی کرب کی زنجیر بھی دیکھ
منفرد طرز کے سانچے میں ڈھلا طرزِ نسیمؔ
شکر ہے رب کا بڑا فضل ہے مالک کا عظیم

کفیل الرحمٰن نشاؔط

مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر، استاد دارالعلوم (وقف) دیو بند، صرف تدریس و درس ہی میں یکتائے روزگار نہیں بلکہ تحریر و تقریر میں بھی اپنے والدِ بزرگوار حضرت سید محمد ازہر شاہ قیصر رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر صبا رفتاری کے ساتھ گامزن ہیں۔ اپنے والدِ ماجد سے فطرتاً اور مزاجاً متعلق ہونے کے سبب، آپ نے اپنے والد کے ادبی اور علمی صحافت سے مزین ورثے سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ کا یہ ریاض حضرتِ ازہر شاہ قیصرؒ کے سایۂ عاطفت میں ہی قائم ہوا اور ہر طرح کے مضامین لکھنے کی مہارت بہم پہنچائی **نتیجۃً** آج آپ ایک کامل نثر نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں متعارف ہیں۔

نسیم اختر شاہ قیصر کے مضامین کی بنیادی خصوصیت زبان کی سادگی پر منحصر ہے جو ہر علمی اور عام فہم قاری کو اپیل کرتی ہے اشاروں اور کنایوں میں بصیرت افروز نکتے اس طرح پروتے ہیں کہ بے ساختہ تحسین کے کلمات قاری کو ادا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مرتب مؤلف اور مصنف ہیں۔ طبع زاد مضامین لکھنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین ملک کے مقتدر ادبی، دینی رسالوں کے علاوہ ریڈیو اور دور درشن سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے والدِ بزرگوار پر آپ نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں اکابرِ دیو بند مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد میاں دیو بندی، اور حضرت انور صابری پر آپ کے ادبی مضامین ان حضرات پر سچے خراجِ تحسین کے ساتھ ایک یادگار دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جو کتابی شکل میں عنقریب منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ یقین ہے کہ آپ کی اس کوشش کو بھی دینی و ادبی حلقوں میں تحسین سے نوازا جائے گا۔ انشاء اللہ

ڈاکٹر ظفر مراد آبادی (دہلی)

AZHAR ACADEMY
SHAH MANZIL ,MOH. KHANQAH ,
DEOBAND-247554 (U.P.)